گلبن

قیمت ۸ر

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲ | فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۴۲ء | شمار

ملاحظات ---------- ۱
ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر ---- سید حکیم احمد نقوی ---- ۵
[illegible] اشتراکیت کی جد و جہد ---- صدرالدین عظیم ---- ۱۳
[illegible] نظیری ---------- (حکیم) سید اعجاز احمد معجز ---- ۱۷
خاکِ دامن گیر ---------- کلیم اللہ۔ام۔اس۔سی ۲۰
ناظورۂ کشمیر (نظم) ---------- مرزا جعفر علی خاں اثر ---- ۲۶
غزلیں ---------- پروفیسر شور۔ سلیمان اریب۔ ۲۷
قتیلؔ پنجابی تھا ---------- مالک ام۔ام۔اے ---- ۲۸
مکتوبات نیاز ---------- ۳۰
کیا کہنا! (نظم) ---------- (خان بہادر) مرزا جعفر علیخاں اثرؔ ۳۴
باب الاستفسار ---------- ۳۵
وقت کی باتیں ---------- ۳۷
اعتبارات ---------- ۴۰

ملاحظات

عرضِ حال جون کا مہینہ یونتو تمام شمالی ہند کے لئے قیامت کا مہینہ تھا، لیکن میرے لئے خصوصاً بہت ہی روح فرسا اور ایذا رساں ثابت ہوا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کا انتہائی درجۂ حرارت کبھی ۱۱۴ ڈگری سے زیادہ نہیں بڑھا اور وہ بھی صرف ہفتہ عشرہ کے لئے، لیکن اس مرتبہ گرمی ۱۲۳ درجہ تک پہونچ گئی اور لوہ کی شدت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان و زمین تنور ہو کر رہ گئے ہیں اور انسانوں کی حالت ایسی تھی جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈالدیا جائے۔ یہ تکلیف تو خیر تھی ہی، اس پر طرہ یہ کہ نینی تال سے واپس آنے کے بعد میں بیمار بھی پڑ گیا اور اور پورا مہینہ اُس حال میں گزر گیا جس کا ذکر میرؔ نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم !

تفصیل کیا عرض کروں، یوں سمجھئے کہ دل و دماغ دونوں جواب دے چکے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ شاید جولائی کے رسالہ میں آپ کوئی اور خبر سنیں گے لیکن شکر ہے، قدرت نے چند دن کی مہلت اور دیدی اور میں آج ۳۰ر جون کو اس قابل ہو سکا ہوں کہ یہ چند سطریں لکھ سکوں

ظاہر ہے کہ ان حالات میں پرچہ اپنی مرضی کے مطابق مرتب نہ کر سکتا تھا، اہم "ہوش" میں رہنے کا کوئی لمحہ میں نے ضایع نہیں کیا اور نگار کی خصوصیات برقرار رکھنے کی کوشش رائیگاں نہ گئی۔ اب بھی میں اس قابل نہیں ہوں کہ دماغ پر زیادہ زور دے سکوں، لیکن اگر ہفتہ عشرہ میں یہ کیفیت کم ہو گئی، تو احباب کے ان خطوں کا جواب بھی دے سکوں گا جو عرصہ سے بند پڑے ہیں اور جن کے جواب نہ دے سکنے کا مجھے سخت افسوس ہے۔

لڑائی کی تیسری منزل

کسی ماہانہ رسالہ میں جنگ پر تبصرہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن شکر ہے کہ اب لڑائی کے حالات میں ہ
تبدیلیاں اتنی جلد جلد نہیں ہو رہی ہیں کہ آج کی چیز کل باسی نظر آئے۔ علاوہ اس کے ہم لوگوں کا
پر کہنا سننا گپ سے زیادہ کچھ نہیں اور گپ کبھی پرانی ہوتی نہیں!

یونتو جب تک لڑائی ختم نہ ہو، نہ انجام کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم کی جاسکتی ہے اور نہ درمیانی انقلابات کے بابت کچھ کہا جاسکتا
تاہم بعض باتیں ایسی ضرور ہوتی ہیں، جنھیں دیکھ کر ہم ایسے معمولی آدمی بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا نتیجہ خیز ہونا ضروری ہے، اور زیادہ سے زیا
ہم انھیں باتوں پر گفتگو کرسکتے ہیں

دوران جنگ میں اول تو ساری خبریں ہم تک پہونچتی نہیں، اور جو پہونچتی بھی ہیں، اُن میں مصلحت آمیزی اس قدر شامل ہوتی ہے کہ قیا
واندازہ سے بھی کام لینا خطرہ سے خالی نہیں، لیکن نہ چھپ سکنے والی بڑی بڑی باتیں آخر کار معلوم ہو ہی جاتی ہیں اور وہی ہم لوگوں کی گ
کا موضوع ہوا کرتی ہیں

جنگ میں خبروں کی ایک قسم تو وہ ہے جو خانہ پُری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، مثلاً دشمن کے فُلاں فُلاں مقامات پر کامیابی سے بمبا
کی گئی۔ فلاں فلاں جہازوں پر کامیابی کے ساتھ نشانہ بیٹھا۔ فلاں فلاں کارخانوں میں سیکڑوں میل سے شعلے بھڑکتے نظر آئے۔ وغیرہ وغ
ان خبروں سے مقصود صرف اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے، اور اپنی زندگی کا ثبوت دینا دشمن کی ہلاکت سے علٰحدہ ایک چیز ہے جسے ہم صرف "نفسیا
دربست کہہ سکتے ہیں۔ لیکن خبروں کی ایک قسم اور بھی ہے جس کا چھپانا ممکن نہیں اور انھیں "ناگزیر" قسم کی خبروں سے ہم اپنے جذبا
بیم ورجا کی تسکین کرلیا کرتے ہیں

جون میں ہم کو اس طرح کی تین خبریں سننے میں آئیں۔ ایک روس و برطانیہ کا جدید معاہدہ، دوسرے جرمنی کا سباسٹوپول اور خارکو
پر زبردست اقدام اور تیسرے طبروق کا سقوط اور ان میں ہر خبر اپنی جگہ بے انتہا وزنی اور حد درجہ اہم ہے

۱- پہلی خبر کے متعلق سوچنے کی ایک بات یہ ہے کہ جب برطانیہ و روس میں اس سے پہلے معاہدۂ اتحاد ہو چکا تھا تو اب دوبارہ اس
جدید معاہدہ کی ضرورت کیوں پیش آئی، دوسرے یہ کہ اس جدید معاہدہ کا اثر روس کے حال و مستقبل پر کیا پڑے گا اس معاہدہ کی ضرورت
اس لئے بھی تھی کہ پہلے معاہدہ میں امریکہ شامل نہ تھا اور اب شرکت جنگ کے بعد اس کا بھی فریق معاہدہ بننا ضروری تھا۔ لیکن ایک دوسرا پہلو
اور بھی ہے وہ یہ کہ لڑائی کا فیصلہ چونکہ روس ہی کی سرزمین پر ہوتا معلوم ہوتا ہے اس لئے ضرورت تھی کہ روس کے مقاصد کو اپنے مقاصد سے
قریب تر رکھنے کی احتیاط کرلی جائے تاکہ بعد اختتام جنگ شرائط صلح کی تعیین کے وقت ان خطرات کے پیدا ہونے کا امکان ضعیف ہو جائے، جو اشتر
اشتراکیت اور ڈاکریسی کے تصادم اغراض سے رونما ہو سکتے ہیں

اس معاہدہ سے روس کو فی الحال سب سے بڑا فایدہ یہ پہونچے گا کہ برطانیہ و امریکہ کی امداد بیش از بیش اسے حاصل ہو سکے گی اور ممکن ہے
جرمنی کے خلاف برطانیہ کوئی نیا موریہ قایم کرکے روس میں دشمن کے دباؤ کو بھی کم کردے۔ اس معاہدہ کا مستقبل البتہ تاریکی میں ہے تاہم یہ با
واضح ہے کہ اگر روس کو شکست ہوتی ہے، تو پھر یہ معاہدہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور اگر روس کو کامیابی ہوتی ہے تو دُنیا کی جدید تنظیم میں اگر
ڈاکریسی و اشتراکیت کو ملایا نہ جاسکا تو اشتراکیت کے لئے ایک حد فاصل قایم ہو سکے گی اور "بالشویت" کو زیادہ معتدل صورت اختیار کرنا پڑے گ
کیونکہ اگر روس اس جنگ میں کامیاب ہوا تو اس کامیابی کا بڑا سبب امریکہ و برطانیہ کی مدد ہوگی اور شرائط صلح کی تعیین میں قدرتاً ان کی آوا
کو زیادہ بااثر ہونا چاہیئے

بہرحال روس و برطانیہ کا جدید معاہدہ بڑی اہم چیز ہے اس وقت دوران جنگ میں بھی اور جنگ کے بعد بھی اگر جرمنی کو ناکامی ہوئی

۲- جرمنی کا تازہ حملہ روس کی طرف ۲۲ مئی سے شروع ہوا ہے اور اس وقت ایک مہینہ ختم ہونے کے بعد بھی کوئی نتیجہ اس کا نہیں نکلا۔
اسوقت جو خبریں آرہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی اپنی پوری قوت اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح وہ سباسٹی پول پر قابض ہو جا

خارکوف کی طرف روسیوں کو پیچھے ڈھکیل کر قفقاز کا راستہ ان پر بند کر دے

پچھلے سال روس میں جرمنی کا نقشۂ جنگ کچھ اور تھا۔ اُس وقت تو صورت یہ تھی کہ ہٹلر سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ پولینڈ سے اُٹھکر اوکرائن ۔ سید روس، ماسکو، لینن گراڈ اور تمام یورپی علاقہ روس کا فتح کرتا ہوا کوہستان اورال تک آسانی سے پہونچ جائے گا اور اس گلگشت میں کوئی اس کا مزاحم نہ ہوگا، لیکن اب حالت کچھ اور ہے۔ ہٹلر اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ وہ روس کے پر وبال نوچنے میں کامیاب نہیں سکتا اور وہ اُسے اس حد تک نیچا نہیں دکھا سکتا کہ اس سے من مانی شرطیں منوا سکے، اسی کے ساتھ خود جرمنی پر پچھلے دو سال میں جتنا بوجھ پڑا ہے وہ اسے زیادہ عرصہ تک جنگ جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے ہٹلر چاہتا ہے کہ جلد سے جلد جتنا فایدہ بھی روس سرزمین سے اُٹھایا جا سکتا ہے، اُٹھالے ۔ اور یہ فایدہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ باکو کے پٹرول پر قابض ہو جائے جس کی اسے شدید ضرورت ہے

اگر سباسٹپول پر اس کا قبضہ ہو گیا اور خارکوف کی طرف اس نے روسی فوجوں کو اتنا پیچھے ڈھکیل دیا کہ وہ قفقاز کی طرف نہ بڑھ سکیں، تو قفقاز کے کوہستان کو عبور کر کے باکو کی طرف بڑھے گا اور پھر نہ صرف عراق و ایران بلکہ تمام مشرقِ ادنیٰ لڑائی کا اکھاڑا بن جائے گا

اس وقت تک جو خبریں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سباسٹپول میں روسیوں کی حالت نازک ہے اور خارکوف کی طرف بھی حالات وہ امید افزا نہیں، لیکن روس کی سخت جانی کو دیکھتے ہوئے مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں

بہرحال اگر سباسٹپول، روس کے ہاتھ سے نکل گیا (جو اس لڑائی کا رُخ پھیر دینے والا واقعہ ہوگا) تو بحرِ اسود میں روسی بیڑا بھی ایک حد تک بیکار ہو جائے گا اور خارکوف کی طرف سے روسی فوجوں کی نقل و حرکت بھی دشوار ہو جائے گی۔ اس صورت میں قفقاز کی حفاظت کی ذمہ داری زیادہ تر اتحادیوں کی اس فوج پر عاید ہوگی جو عراق و ایران میں موجود ہے اور اس جنگ میں شاید یہ پہلا سخت معرکہ ایشیا کی سرزمین پر ہوگا

اس میں شک نہیں کہ قفقاز کا راستہ بہت دشوار گزار ہے اور ہٹلر آسانی سے کوہستان قاف کو عبور کر کے باکو تک نہیں پہونچ سکتا، لیکن اس جنگ نے ممکن و ناممکن کے فرق کو گھٹا کر بہت کم کر دیا ہے، اس لئے نقل و حرکت کی دشواریوں کو سامنے رکھ کر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا یہ ضرور ہے کہ عراق و ایران کی طرف اتحادیوں کی طیاریاں بہت زبردست ہیں اور انھیں پر ہم کو اعتماد ہو سکتا ہے

اگر ہٹلر کو سباسٹپول لینے میں کامیابی نہ ہوئی، تو پھر وہ مجبور ہوگا کہ ترکی کے راستہ سے عراق ہوتا ہوا باکو تک پہونچے اور یہ وقت وہ ہوگا جب ترکی کو اِدھر یا اُدھر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا اور یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس کا فیصلہ کیا ہوگا

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت ہٹلر نے کریمیا اور خارکوف میں دباؤ ڈالنا شروع کیا اسی وقت اس نے لیبیا کی جنگ شروع کر دی، حالانکہ سخت گرمی کے زمانہ میں ریگستان لیبیا کو معرکہ زار بنانا معمولی بات نہ تھی، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ برطانوی فوجیں نہایت مضبوطی سے وہاں قدم جمائے ہوئے تھیں

بات یہ ہے کہ ہٹلر نے فی الحال جو نقشۂ جنگ بنایا ہے، وہ یہ ہے کہ اُدھر روس میں کریمیا کی طرف سے آگے بڑھے اور اِدھر فلسطین و عراق کی طرف سے اقدام کرے۔ گویا وہ مشرقِ ادنیٰ کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر، عراق، ایران اور باکو کے پٹرول تک پہونچنا چاہتا ہے۔ ترکی کے راستہ سے بھی یہ گھیرا ڈال سکتا تھا، لیکن اول تو وہ ترکی کی غیر جانبداری کو اس وقت چھیڑنا نہیں چاہتا اور دوسرے یہ کہ جب تک فلسطین، شام اور مصر کی اتحادی فوجوں کی طرف سے وہ مطمئن نہ ہو جائے یہ گھیرا کامیاب نہیں ہو سکتا، بلکہ خود گھر جانے کا اندیشہ ہے

وہ جانتا ہے کہ سواحل مصر سے لیکر سواحل عرب تک اتحادی فوجیں ہر جگہ نہایت کثرت سے موجود ہیں اور صحیح تدبیر جنگ اُن کے درمیان سے گزر جانا نہیں بلکہ اُن کا احاطہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے، اور اسی لئے اس نے بیک وقت لیبیا اور کریمیا دونوں طرف اقدام شروع کیا

تاکہ پشت سے حملہ ہونے کا امکان دور ہو جائے

افسوس ہے کہ لیبیا میں برطانیہ کو اس وقت تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ طبروق بھی ہاتھ سے نکل گیا اور مطروح بھی خالی کیا جا رہا ہے اس کے بعد اب اسکندریہ ہی رہ جاتا ہے جو مصر و لیبیا کی جنگ میں ایک "کلید" کی حیثیت رکھتا ہے

طبروق کا ہاتھ سے نکل جانا، سنگاپور اور برما کے سقوط سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ یہی طبروق ہے جس نے اس سے قبل ۲۵۰ دن تک دشمن کا مقابلہ کر کے اور داخل ہونے سے اُسے روک رکھا تھا، یہاں تک کہ وہ ناکام واپس گیا، یا اب وہ ایک دن بھی مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ درانحالیکہ بہترین برطانوی فوجیں وہاں موجود تھیں، چنانچہ اس واقعہ کا اثر برطانوی پبلک پر اس حد تک ہوا کہ اب مسٹر چرچل سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اس کا جواب دیں اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں مسٹر چرچل کو پھر ارکان وزارت میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا پڑے

کسی خطرہ یا مصیبت سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم ہر بات کو تفاؤلانہ (Optimistic) انداز سے دیکھیں، بلکہ تاریک سے تاریک پہلو کو سامنے رکھ کر ہمیں تدابیر اختیار کرنا چاہئے۔ اس لئے اگر ہم یہ کہدیں کہ طبروق کا سقوط بہت معمولی بات ہے اور اس کا کوئی اثر جنگ پر نہیں پڑتا، یا یہ کہ کریمیا میں جرمنی کی کامیابیاں بالکل بے نتیجہ ہیں تو یہ نہایت غلط قسم کا مداوا ہوگا، لیکن باوجود ان تلخ حقیقتوں کے بھی اتحادی کامیابی کے امکانات بہت قوی ہیں

جنگ کی موجودہ حالات اس میں شک نہیں کہ جرمنی کی موافقت میں ہیں اور اس سے انکار حقیقت کا انکار ہوگا، لیکن جیسا کہ میں نے عنوان میں ظاہر کیا ہے یہ جنگ اپنی تیسری منزل سے گزر رہی ہے، اور یہی منزل اتحادیوں کی کامیابی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے

میں نے تیسری منزل کی تعیین اتحادیوں کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ جرمنی کے زاویۂ نگاہ سے کی ہے، کیونکہ جرمنی جس منزل سے گزر رہا ہے وہ اس کے لئے خستگی کی منزل ہے اور اتحادی اس حیثیت سے پہلی ہی منزل میں ہیں، یعنی وہ ابھی تک اپنے حوصلہ و اندازہ کے مطابق پوری طیاری بھی نہیں کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جب اتحادیوں نے باوجود پوری طرح طیار نہ ہونے کے دو سال تک جرمنی کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا، اور اسے تھکا کر اس حد تک پہونچا دیا کہ اگر وہ جلد کامیاب نہیں ہوتا تو اس کی شکست یقینی ہے، تو اب جبکہ ان کی طیاریاں اپنے شباب تک پہونچنے والی ہیں، جرمنی کو اپنی کامیابی کی کیا توقع ہو سکتی ہے

لڑائی کی درمیانی منزلوں میں کسی مقام کا ہاتھ سے نکل جانا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا اس پر قابض رہنے کی حالت میں لڑائی کے پھیلاؤ کو سنبھالے رکھنا، اور اس باب میں اب ناتسی حکومت کا ضعف ہر جگہ رونما ہو رہا ہے۔ اول تو ابھی کریمیا ہی کا معرکہ اسے سر کرنا ہے، اس کے بعد اسکندریہ، حیفہ، شام و عراق کے ہفت خوان طے کرنا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ یہ سب آسانی سے اور جلد طے کر سکے گا

اس میں شک نہیں کہ جرمنی نے اب اپنا سب کچھ سامنے رکھ کر یہ قدم بڑھایا ہے اور اسی قدم پر اس کی تمام امیدوں کا انحصار ہے لیکن اسی کے ساتھ جب ہم دوسری طرف دیکھتے ہیں تو ہم صرف ایک ہی نتیجہ پر پہونچتے ہیں اور وہ یہ کہ وقت کی دوڑ میں ہٹلر کی ناکامی بالکل یقینی ہے اور لڑائی پر جتنے دن گزرتے جا رہے ہیں اتنا ہی زیادہ ناتسی آفتاب ڈھلتا جا رہا ہے۔ کیونکہ منزل مقصود کا کوسوں پتہ نہیں اور تھک کر بیٹھ جانے میں اب کچھ دنوں کی دیر ہے

اس لئے سوال اس وقت نہ کریمیا و لیبیا کا ہے، نہ عراق و باکو کا۔ بلکہ صرف ڈٹے رہنے کا ہے اور اس باب میں اتحادیوں کی پوزیشن جتنی صاف و واضح ہے، اس سے شاید دشمن کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

ضروری اطلاع

اگر آپ نے خط و کتابت میں نمبر خریداری درج نہ کیا تو نہ ہم آپ کو دوبارہ پرچہ بھیج سکتے ہیں، نہ آپ کا پتہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ نمبر خریداری ہر مہینہ پتہ کی چٹ پر بائیں طرف انگریزی ہندسوں میں درج رہتا ہے۔ اسے کسی جگہ نوٹ کر لیجئے۔

منیجر نگار

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر

ہندوستان میں مسلمان قومیں زیادہ تر ایران اور افغانستان کے راستے سے آئی ہیں اور مسلمانانِ ہند کی تہذیب و معاشرت کی بنیاد بیشتر حصہ ایران ہی کی تہذیب پر قایم ہے۔ اسلامی حکومت کے دور میں دفتروں کی زبان بھی ایران کی زبان رہی اور جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق ہے ۱۸۵۷ء تک سیاسی معاہدات اور تحریرات کے لئے فارسی زبان ہی مخصوص تھی۔ اس کے بعد بھی اکثر تعلیم یافتہ لوگ اُردو کی جگہ فارسی ہی میں خط لکھا کرتے تھے اور اب بھی اُردو لکھنے پڑھنے والوں کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ وہ فارسی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہوں، ان حالات میں اگر ایران اور ایران کی زبان فارسی کے متعلق مختصر طور پر ایک عام اور صاف مفہوم پیش کرنے کی جرأت کی جائے تو ایسی کوشش غالباً غیر موزوں خیال نہ کی جائے گی۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ایران کس خطۂ ملک کو کہتے ہیں اور وہاں کے رہنے والے کس ابتدائی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے نقشہ ملاحظہ طلب ہے۔ اگرچہ یہ نقشہ باقاعدہ طریق پر مرتب نہیں ہوا ہے۔ اس نقشہ میں ذیل کی حدود نشان کرنے کے قابل ہیں :-

۱- نقشے کے مشرق میں (سیدھے ہاتھ کی طرف) سب سے اوپر بدخشان۔ اُس کے نیچے کابل اور اُس کے نیچے بلوچستان۔

۲- شمال میں (اوپر کی طرف) (۱) سُغدیانہ۔ (۲) دریائے جیحون اور بحیرۂ کاسپین کے درمیانی علاقے بلخ۔ مشہد۔ خوارزم۔ استرآباد۔ (۳) بحیرۂ کاسپین کے مغرب میں آرس کا جنوبی علاقہ معہ آذربائجان۔

۳- جنوب میں (نیچے کی طرف) مکران۔ لارستان۔ اور پارس۔

۴- مغرب میں (اُلٹے ہاتھ کی طرف)۔ (۱) اِصفہان اور کاشان سے لیکر آرمینیا کے کوہستان تک (۲) کُردستان۔ (۳) خوزستان۔

قدیم زمانہ میں وہ خطہ جو حدودِ مذکورہ پر مشتمل اور اُن میں داخل ہے ایران کہلاتا تھا۔ پارسی روایاتِ قدیمہ کے مطابق جیسا کہ شاہنامۂ فردوسی وغیرہ میں درج ہے لفظ ایران فریدوں کے بیٹے ایرج نامی سے منسوب ہے لیکن یہ لفظ کتاب آوستان میں ایریانہ لکھا ہوا پایا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ قوم اِیریا کی سرزمین تھی۔ یہی لفظ سنسکرت میں آریہ لکھا گیا ہے اور دونوں زبانوں میں قریب قریب ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جب اہلِ یونان کا سابقہ ایرانیوں سے پڑا تو اُنھوں نے اس ملک کا نام "پرسیس" قرار دیا اور اُن کے بعد اہلِ عرب نے بھی اُس کو فارس کے نام سے موسوم کیا۔ نقشے کے دیکھنے سے ظاہر ہوگا کہ ایران کے جنوب میں خلیج فارس سے ملحق ایک علاقہ ہے جس کا نام قدیم زمانہ میں پارسا تھا اور بعد میں پارس کہلانے لگا۔ یہ علاقہ یا صوبہ اپنے اُسی نام کے ایک قدیم شہر سے منسوب تھا جس کو یونانیوں نے اپنی زبان میں پرسیس کے نام سے بدل دیا۔ چونکہ اہلِ یونان اور اہلِ عرب کے حملوں کے وقت اسی علاقے کے بادشاہوں کی سارے ایران پر حکومت تھی اس لئے ان دونوں قوموں نے سارے ایران کو پارس کہکر پکارا۔ ورنہ پارس ایران کے اُس جنوبی حصہ کا نام ہے جس کا ذکر شیخ سعدی نے اپنے مندرجۂ ذیل شعر میں کیا ہے :-

یارب زبادِ فتنہ نگہدار خاکِ پارس
چنداں کہ خاک را بود و باد را بقا

اسی نہج پر لفظ 'پارسی' کے معنوں کی کیفیت سمجھنی چاہئے۔ ایک معنی میں 'پارسی' ایران کی زبان کو کہتے ہیں اور دوسرے معنی میں ایران کے باشندہ کو 'پارسی' کہا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت سلمان فارسی۔ لیکن آجکل اہلِ ایران اپنے آپ کو ایرانی کہتے ہیں اور پارسی قوم سے صرف وہ ایرانی

لے نقشہ دیر میں ملا اس لئے اب مضمون کے آخر میں شامل کیا جائے گا۔ (نگار)

مراد ہیں جو مذہب زردشتی رکھتے ہیں۔ پروفیسر براؤن نے ظاہر کیا ہے کہ اس لفظ کا یہ مفہوم ہندوستان کی ایجاد ہے مگر یہ معنی ایران میں بھی رائج ہو گئے ہیں۔

اس تعیین کے بعد کہ قدیم زمانہ میں ایران کی حدود میں بدخشاں۔ سغدیانہ۔ کابل۔ بلوچستان۔ بلخ۔ خراسان۔ مازندران۔ گیلان۔ آذربائیجان کردستان۔ خوزستان۔ عراق عجم۔ فارس۔ کرمان۔ لارستان۔ مکران۔ داخل اور شامل تھے۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ بہ اعتبار تاریخی معلومات کے قدیم اہل ایران کس قوم سے تھے اور موجودہ ایرانی کس نسل سے ہیں۔

فردوسی کا شاہنامہ حقیقی معنی میں ایران کی قدیم روایات کا دفتر ہے اور ہو بہو ساسانیوں کے زمانہ کی سینہ بہ سینہ منتقل شدہ حکایات اور پہلوی کتابوں کی روایات کا مجموعہ ہے۔ روایات و حکایات صرف اس قدر ظاہر کرتی ہیں کہ ایران کے ابتدائی تمدن و تہذیب و حکومت کی نسبت ایسے خاندان سے تھی جس کو پیشدادی خاندان کہتے ہیں۔ اُس کے بعد کیانیوں کی حکومت ہوئی جو سکندر کے حملہ تک قایم رہی۔ سکندر کے بعد طوائف الملوکی کا دور رہا جسکو ساسانی حکومت نے ختم کیا۔ مسلمان مورخوں نے اور اُن کے ساتھ پارسی علماء نے اپنا رسوخ پیدا کرنے کی غرض سے قریب قریب اسی سلسلہ کو قایم رکھا۔ اور یہودی روایات کی بنا پر پیشدادی بادشاہوں کا سلسلہ آدم و نوح سے منسوب کرکے روایاتِ ایرانی میں عجیب و غریب اضافہ کر دیا اور ایرانی قوم کو سامی اقوام میں مخلوط کر دیا۔

زمانۂ حال کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا ہے کہ جس قوم کو اب آریہ کہا جاتا ہے اُس کے متفرق فرقے کسی قدیم زمانے میں ایران میں وارد ہوئے اور اُنھیں فرقوں کی نسل اُس زمانہ سے ابتک ایران میں آباد ہوتی چلی آئی ہے۔ البتہ اہلِ عرب کے تسلط کے بعد سے اُن میں عرب۔ مغل۔ ترک اور افغان قوموں کی کم و بیش آمیزش ہوتی رہی ہے۔ آریہ فرقے کس وقت اور کس ترتیب کے ساتھ ایران میں داخل ہوئے اِس کی بابت کوئی معلومات صحت کے ساتھ فراہم نہیں ہو سکی ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ اقوام آریہ سے کیا مُراد ہے یہ ذہن نشین ہونا چاہئے کہ اہلِ تحقیق نے دنیا کی آبادی کو مختلف النسل قرار دیکر متعدد شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے گو سب انسان نفسِ واحد ہی سے پیدا ہوئے ہوں مگر محققین ابھی تک اُس نقطۂ ابتدائی یا مرکز پر نہیں پہونچے ہیں جہاں سے یہ شاخیں پھوٹی ہوں۔ اختلافِ نسل کا انحصار بہت کچھ اقوام کے ابتدائی مسکن پر ہے۔ قیاس یہ کیا گیا ہے کہ جس سمندر کو اب بحیرۂ کاسپین کہتے ہیں کسی زمانۂ بعید میں بہت وسیع تھا اور خراسان سے لیکر قسطنطنیہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اُس سمندر کے اوپر کا حصہ۔ وہ علاقہ تھا جس کو وسط ایشیا اور روس کا فرنگی علاقہ کہتے ہیں۔ اُس کے نیچے وہ علاقے تھے جن کو اسوقت ایشیائے کوچک۔ شام۔ عراق عجم اور ایران وغیرہ کہتے ہیں۔ جو فرقے وسطِ ایشیا اور روس کے علاقے میں پرورش پا رہے تھے اُن کو آریہ کہا جاتا ہے۔ یہ فرقے کسی وقت خانہ بدوشی کے عالم میں اوقات بسر کرتے تھے اور جب اور جس طرف اُن کو موقعہ ملتا تھا گھس جاتے تھے۔ اُن میں سے بہت سے یوروپ کی طرف چلے گئے۔ اور اکثر ایران و ہند میں داخل ہو گئے۔ جس وقت تک یہ سب فرقے وسط ایشیا اور علاقۂ روس میں جاگزیں تھے۔ اُن کا ایک ہی قوم سے متعلق ہونا مانا جاتا ہے اور بحیثیتِ مجموعی اُن کا نام ہندو یوروپ کی قومِ آریہ رکھا گیا ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ اس آریہ قوم کے جو فرقے نیچے کی طرف چلے وہ سب سے پہلے افغانستان میں داخل ہوئے۔ اور یہاں سے ایک طرف پنجاب میں چلے گئے اور دوسری سمت ایران کے علاقوں میں منتقل ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ آریہ اولاً پنجاب میں آئے اور وہاں سے ایرانیوں کا افتراق ہوا ایک رائے یہ بھی ظاہر کی گئی ہے کہ آریوں کے متفرق فرقے مختلف سمتوں سے ایران میں داخل ہوئے ہیں۔ مثلاً افغانستان کی راہ سے اور خراسان کی جانب سے اور بحیرۂ کاسپین کی شمال و مغربی سمت سے۔ یہی رائے قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال یہ امر حقیقت کے طور پر مان لیا گیا ہے کہ موجودہ ایرانیوں کے آباؤ اجداد اور ہندوستان کے آریوں کے مورث کسی وقت ایک ہی مقام پر رہتے تھے اور ایک بولی بولتے تھے۔ یہ بات بھی قرینِ قیاس خیال کی گئی ہے کہ ہندوستان کے آریہ ایران اور افغانستان کے راستہ ہی سے ہندوستان میں داخل ہوئے ہیں۔ ان خیالات کی تائید میں یہ اُمور بیان کئے گئے ہیں کہ رگ وید میں ایسے مقامات کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلق افغانستان سے ہے اور یہ کہ سنسکرت اور فارسی کے الفاظ کثرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ قیاس مذکور کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ایران میں جن ابتدائی آریہ فرقوں کا پتہ چلا ہے وہ عناصر پرست اور آفتاب و

ماہتاب پرست پائے جاتے ہیں اور یہی کیفیت اُن آریہ فرقوں کی ہے جو ہندوستان میں وارد ہوئے اور جن سے رِگ وید کے ابتدائی حصوں کی تصنیف متعلق ہے۔ ہندوستانی آریوں میں بت پرستی وغیرہ بعد کا اضافہ ہے۔

ہندوستان میں آریوں کے ورود کا تعین مختلف طور پر کیا گیا ہے۔ افراط و تفریط کو چھوڑ کر درمیانی رائے یہ قرار پائی ہے کہ اقوام آریہ ہندوستان میں سنہ عیسوی سے یقیناً ایک ہزار برس سے ڈیڑھ دو ہزار برس قبل تک پہونچی ہیں۔ اسی نہج پر قیاس کر لینا چاہئے کہ ایران میں بھی اُسی زمانہ میں یا اُسکے آس پاس کے زمانہ میں اقوام آریہ داخل ہونا شروع ہوئی ہوں گی۔

ایران میں آریوں کے وارد ہونے سے پہلے جو قومیں آباد تھیں اُن میں سے بعض کا پتہ چلا ہے جس سے یہ قیاس کیا گیا ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایران میں ایسی قومیں بستی تھیں جو ترکی النسل تھیں یا اُس نوع کی حبشی نسل والی تھیں جس میں ہندوستان کی قدیم ڈراوڈی قوم داخل سمجھی جاتی ہے۔ ایران میں رے ایک مشہور مقام ہے۔ آریوں سے پہلے اس علاقہ میں ایک قوم منّدا کا وجود تحقیق سے ثابت ہوا ہے۔ اس قوم کا ترکی النسل ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ جب آریوں کا وہ فرقہ کوہستان قاف یا خراسان کو پار کر کے ایران کے علاقۂ آذربائیجان میں داخل ہوا جس کو اہلِ یونان نے قوم میڈ کہا ہے اور فارسی لٹریچر میں ماد اور ماہ آبادی بیان کیا گیا ہے تو اُس کا تصادم عرصہ تک قوم منّدا سے ہوتا رہا جو رے کے علاقہ میں آباد تھی۔ اسی طرح وہ قوم جس کا نام سُمیری ہے اور جس نے عراق میں دریائے فرات کے کنارے عیسوی سنہ سے کئی ہزار برس پہلے شہری حکومتیں قایم کیں ترکی النسل مانی گئی ہے۔ اس طور پر یہ مان لینے میں ہرج نہیں ہے کہ ایران میں سب سے پہلے ترکی النسل قومیں یا ڈراوڈی قسم کی قومیں آباد تھیں۔ ڈراوڈی قسم کے فرقے اُس علاقہ سے پائے جاتے ہیں جس کو اب خوزستان کہتے ہیں اور جو قدیم زمانہ میں ایلام کہلاتا تھا۔ اسی حلقہ میں علاقۂ پارس شامل تھا۔

دریائے فرات کی حکومتوں کا گہرا تعلق ایرانی علاقجات سے پایا جاتا ہے۔ ابتدائی سُمیری قوم کے بعد فرات کے علاقوں پر سامی نسل کے لوگ مسلط ہو گئے تھے اور اس نسل کی حکومتوں اور سلطنتوں (انھیں میں بابل کی شہنشاہی بھی شامل ہے) سے اور ایرانی علاقوں سے ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ دریائے فرات کے ایک قدیم شہر شرفورلہ کے بادشاہ اِین۔تمی۔نا کا ایک سنگین کتبہ برآمد ہوا ہے جس میں ذکر ہے کہ بادشاہ مذکور کے باپ ای۔انّا۔تم نے ایلام کو فتح کیا۔ ای۔انّا۔تم کا زمانہ ۴۲۰۰ ق۔م۔ کا قرار دیا گیا ہے۔ شرفورلہ کے بعد دریائے فرات پر دوسری بادشاہی موسوم بہ کش قایم ہوئی اور اِس شہر کش کے آثار سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے ایک بادشاہ نے تقریباً تین ہزار آٹھ سو پچاس سال قبل مسیح میں ایلام کو معہ علاقۂ پارسی کے فتح کیا اور وہاں سے سنگ مرمر کے پیالے لوٹکر لایا ۲۳۶۰ ق۔م میں اہلِ ایلام بابل پر قابض نظر آتے ہیں لیکن یہ قبضہ بہت عارضی تھا اور دو ہزار تین سو چالیس سال قبل مسیح حمورابی (معاصر ابراہیم علیہ السلام) نے ایلام والوں کو بابل سے نکال دیا۔ تاہم ۱۸۰۰ ق۔م میں خوزستان کی ایک کوہستانی قوم قسّی خروج کر کے بابل پر قابض ہو گئی اور پانچ سو برس تک بابل میں حکومت کرتی رہی۔ اس قوم کے شاہی خاندان نے اخیر میں سلطنتِ عسوری کے شاہی خاندان سے رشتہ داری اور میل جول پیدا کر لیا تھا اور سامی اقوام میں یہ لوگ مِل جُل گئے تھے لیکن اس کے بعد سلطنتِ عسوری نے عروج کیا اور تقریباً ۱۳۳۰ ق۔م۔ میں بابل اور ایلام کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

کیفیتِ مندرجۂ صدر سے ظاہر ہوگا کہ ایران کا کچھ مغربی اور جنوبی علاقہ فرات کی سامی حکومتوں اور عسوری سلطنت سے اثر پذیر رہا ہے۔ عسوری قوم بھی اُنھیں سامی اقوام کی ایک شاخ تھی جو فرات کے کنارے آباد تھیں۔ لیکن اس شاخ نے بجائے فرات کے دجلہ کے کنارے اُس مقام کے متصل جہاں اب بغداد واقع ہے اپنی حکومت کی بنیاد قایم کی اور اُس حکومت کو شہنشاہی کے مرتبہ تک پہونچا دیا۔ اس شہنشاہی کے زیرِ تسلط ایران کا وہ تمام علاقہ مدتوں تک رہا جس میں اصفہان۔ کاشان۔ طہران۔ ہمدان اور تبریز شامل ہیں۔ قدیم یونانی مورخ اس علاقہ کو میڈیا کے نام سے موسوم کرتے ہیں یعنی قوم میڈ کا مسکن۔ غالباً یہ وہی قوم ہے جس کو ایک قدیم پارسی کتبہ میں مادا اور بعد میں ماہ آباد بیان کیا گیا ہے۔ اقوام آریہ کا یہ پہلا فرقہ ہے جس کا مورخ ذکر کرتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ کوہِ قاف سے گزر کر ایران کے مغربی اور شمال مغربی علاقوں میں داخل ہوا۔ عسوری سلطنت کے کھنڈروں سے جو تاریخی مواد برآمد ہوا ہے اُس میں سے ایک شاہی سنگین کتبہ ہے جس کو ۱۱۰۰ ق۔م کے زمانہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس میں آمادانہ (حال ہمدان) سلطنتِ عسور کی ماتحتی میں ہونا بیان کیا گیا ہے۔ بعد کے دو کتبوں سے بھی جن کا زمانہ ۸۳۱ ق۔م اور ۶۸۰ ق۔م۔ علی الترتیب بیان کیا گیا ہے علاقۂ میڈ

کا سلطنت عسور کی ماتحتی میں ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ کتب یہود میں بھی ذکر ہے کہ شاہ عسور نے سامریا فتح کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو میدیا کے علاقہ میں جلاوطنی کی سزا دی اور یہ واقعہ ۷۲۲ء ق۔م کا ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح یونانی مورخ ہرادتوس نے بیان کیا ہے کہ قوم میڈ صدیوں تک سلطنتِ عسور کی ماتحت رہی اور یہ کہ ۷۰۰ء ق۔م کے زمانہ میں اس قوم نے خود مختاری حاصل کی۔ حالات مذکور سے ظاہر ہوگا کہ ایران کا شمال مغربی۔ مغربی اور جنوب مغربی حصہ کس قدر سامی اقوام کے زیر اثر رہا ہے۔ آگے چلکر یہ بھی ظاہر ہوگا کہ ایرانی اقوام کے خیالات اور زبانیں سامی تعلقات سے کس قدر متاثر ہوئے۔

ہرادتوس کے بیان کے مطابق قوم میڈ نے اپنی خود مختار حکومت قایم کرنے کے بعد ایران کے دیگر علاقہ جات پارس وغیرہ پر بھی قبضہ و اقتدار حاصل کرلیا قدیم یونانیوں میں (Laws of the Medes) اور فارسی کتابوں میں آئین مہ آبادی کا حوالہ ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہے لیکن ان قوانین و آئین کے متعلق کوئی تاریخی مواد ہاتھ نہیں لگا ہے اور نہ اُن کے زمانہ کے کوئی کتبے یا مکتوبات برآمد ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے زمانہ کا کوئی سکہ بھی دستیاب نہیں ہوا ہے حالانکہ اس قوم کا دورِ حکومت تقریباً دو سو برس تک قایم رہا ہے۔ اس لئے تحقیق طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کی زبان اور اُنکا مذہب کیا تھا۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ اُن میں ایک فرقہ ایسا تھا جو اقوام ہند کے برہمنوں کے مانند پوجا پاٹ کرایا کرتا تھا اور جس کو مُغ یا مغوش کہتے تھے اور جو بعد میں مجوس ہوگیا۔

ہرادتوس نے قوم میڈ کے چار بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے بادشاہ کا نام یونانی کتابوں میں دیوکس۔ یا دیوسیس بیان کیا گیا ہے جس نے سلطنت عسوری سے آزادی حاصل کی۔ ۷۱۵ء ق۔م۔ کے ایک عسوری کتبہ میں دیاکو نام کے ایک بادشاہ کے گرفتار کئے جانے کا ذکر ہے اور دوسرے کتبہ میں 'بیتِ دیاکو' کے فتح کئے جانے کا تذکرہ ہے جس کا زمانہ ۷۱۳ء ق۔م کا ہے۔ دیاکو کے بعد ۶۴۷ء ق۔م میں دوسرا بادشاہ فرارتس ہوا۔ قدیم فارسی میں اس نام کو فراورتیش لکھا گیا ہے۔ ۶۲۵ء ق۔م میں فرارتس کا جانشین سیاک زر (قدیم فارسی۔ ہُوخشتَرَ) ہوا جس نے ۶۰۶ء ق۔م میں سلطنت عسور کے پایۂ تخت نینوا کو تباہ و برباد کیا۔ اور ۵۸۵ء ق۔م میں ملک شام کی قوم اریا سے میدانِ جنگ میں سورج گرہن واقع ہونے کے باعث صلح کرلی۔ سیاک زر کے بعد استاجس (قدیم فارسی۔ وشتاسپ) قوم میڈ کا اخیر بادشاہ ہوا۔ اور ۵۵۰ء ق۔م میں سلطنتِ میڈ کا خاتمہ ہوکر ایران کے بادشاہی علاقہ پارس کے ایک خاندان میں منتقل ہوگئی۔

ایران کے شمالی حصہ میدیا سے پاس کے جنوبی علاقہ کے جن لوگوں میں شاہی منتقل ہوئی وہ بھی قوم آریہ کا ایک فرقہ تھا۔ اس فرقہ کو عموماً فارسی قوم کہا جاتا ہے اور اسی نام سے اُس میں اور قوم میڈ میں تمیز کی جاتی ہے۔ جس خاندانِ پارس نے شاہی حاصل کی یونانی زبان میں وہ اکیمنس خاندان کے نام سے مشہور ہے لیکن قدیم فارسی زبان میں ہاکھامنش لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ اُردو میں اخمنی کہنے لگے ہیں۔ اس خاندان کے چند ابتدائی بادشاہوں کا مختصر شجرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

۱- اَکیمینَش - (قدیم فارسی۔ ہاکھامنش)
۲- ٹیس پس - (چائش پش)

۳- کمبسس (کمبوجیہ)
۴- سائرس۔ (کورش)
۵- کمبسس (کمبوجیہ)

۶- اریارمنس۔ (آریارامنا)
۷- آرسیمس۔ (ارشمہ)
۸- ہسٹاسپس (وشتاسپ)
۹- ڈرائس (دارایاوش)

عام طور پر یونانی مورخوں نے اس شجرہ کے چوتھے بادشاہ سائرس کو اس خاندان کا پہلا بادشاہ تصور کیا ہے۔ اسی بادشاہ نے ۵۵۰ء ق۔م میں میں سلطنتِ میڈ کے اخیر بادشاہ استاجس کو شکست دیکر سارے ایران پر قبضہ کرلیا۔ لیکن اس خاندان کے نویں بادشاہ دارایاوش نے اپنے ایک کتبہ میں اپنے آپ کو اپنے دو شاخہ خاندان کا نواں بادشاہ ہونا تحریر کیا ہے اور یہی بات ہرادتوس مورخ نے بھی بیان کی ہے۔

اس اخمنی، خاندان کے اخیر بادشاہ کا نام بھی دارا یا داؤش (دارا) تھا جس پر سکندر یونانی نے فتح حاصل کر کے ایران کی بادشاہی اپنی طرف منتقل کر لی اور اخمنی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

سکندر کی وفات کے بعد اُس کے مقبوضات اُس کے سپہ سالاروں میں تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ ایران کی حکومت سکندر کے سپہ سالار سلیوکس نامی کے حصہ میں آئی۔ سلیوکس نے بابل کو دارالحکومت قرار دیا لیکن اُس کے خاندان میں حکومت تھوڑے ہی عرصہ قایم رہی۔ تین چار پشت کے بعد ہی خراسان والوں نے سرتابی کر کے قومی حکومت ایران کے شمالی حصہ خراسان میں قایم کی۔ جن اقوام خراسانی نے یہ سلطنت قائم کی۔ جن اقوام خراسانی نے یہ سلطنت قایم کی اُن کو انگریزی میں ایک لفظ پارتھیا سے تعبیر کیا گیا ہے اور عربی و ایرانی تاریخ میں اشکانی و اشغانی کے نام سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ حکومت کئی سو برس تک قایم رہی لیکن ایران کی قومی کتابوں اور شاہنامہ میں اس حکومت کا محض بالاجمال حوالہ دیا گیا ہے۔ کوئی تفصیلی واقعات درج نہیں کئے گئے ہیں۔

اشکانی حکومت کو اردشیر (اردشیر بابکان) نے ۲۲۶ء میں اردوان کو شکست دیکر ختم کیا اور اُس ساسانی سلطنت کا آغاز کیا جو یزدگرد ثالث پر ختم ہوئی اُس کے بعد سے عربوں کا تسلط ہوا اور رفتہ رفتہ تقریباً کل اہلِ ایران مسلمان ہو گئے۔ تھوڑے سے لوگ ایران چھوڑ کر ہندوستان میں آباد ہو گئے اور انھیں کی نسل کو پارسی کہتے ہیں۔ ایک قلیل تعداد ایران میں بھی رہ گئی جو زیادہ تر علاقۂ یزد میں اب تک آباد ہے۔

کیفیتِ متذکرہ صدر سے واضح ہوگا کہ ایرانیوں کی تاریخ اجمالی طور پر کئی دوروں پر مشتمل ہے۔

۱۔ پہلا دور وہ ہے جب ہندوستان اور ایران میں وارد ہونے والے فرقے ایک مقام پر رہتے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے یہ مقام وسط ایشیا میں ہونا چاہئے اور اس دور کے زمانہ کو عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ڈھائی تین ہزار برس پہلے کا سمجھنا چاہئے۔

۲۔ دوسرا دور وہ ہے جب علاقۂ مید یا سلطنتِ عسوری کی ماتحتی میں رہا۔ تقریباً ۱۲۰۰ ق۔م سے ۷۰۰ ق۔م تک۔

۳۔ تیسرا وہ دور ہے جس میں قوم مید کی سلطنت کا قیام رہا۔ یعنی ۷۰۰ ق۔م سے ۵۵۰ ق۔م تک۔

۴۔ چوتھا دور اخمنی سلطنت کا دور ہے۔ ۵۵۰ ق۔م سے ۳۳۰ ق۔م تک۔

۵۔ پانچواں دور سکندر کے بعد سے اشکانی حکومت کے خاتمہ تک ہے جس کی مدت ۳۳۰ ق۔م سے شروع ہوتی ہے اور ۲۲۶ء میں ختم ہوتی ہے۔

۶۔ چھٹا دور ساسانی حکومت کا ہے۔ ۲۲۶ء سے ۶۵۱ء تک۔

پہلا دور

پہلے دور کے احوال کی کوئی تفصیل معلوم نہیں لیکن اس قدر ضرور پتہ لگا ہے کہ اُس زمانہ کی چند روایات ہندوستان اور ایران میں اسوقت تک بدلی ہوئی شکلوں میں مشترک طور پر زندہ ہیں۔ نیز جہاں تک ان ملکوں کی زبان کا تعلق ہے زمانۂ مذکور کی زبان کا کچھ اندازہ اُن کثیر التعداد الفاظ سے ہو سکتا ہے جو سنسکرت اور فارسی میں مشترک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رگ وید کی زبان اور آوستا کے ابتدائی حصہ کی زبان میں جو فرق ہے وہ تلفظ یا املا کی خفیف تبدیلی سے دور ہو سکتا ہے۔

روایات کی ذیل میں ایران کی تاریخ کا وہ حصہ آتا ہے جس کو عربی اور ایرانی مصنفین اور ایرانی روایتیں پیشدادی خاندان سے منسوب کرتی ہیں۔ فردوسی کے شاہنامہ کو قدیم ایرانی روایتوں کا مکمل دفتر مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساسانی حکومت کے زمانہ میں روایات مذکورہ پہلوی زبان میں جمع کی گئی تھیں اور یہی مجموعہ ساسانیوں کے زمانہ میں اول دقیقی شاعر کے سپرد ہوا جس نے لہراسپ اور گشتاسپ کا حال نظم کیا اور اُس کے بعد سلطان محمود کی سرپرستی میں فردوسی نے شاہنامہ کی تکمیل کی۔ پروفیسر براؤن کی رائے ہے کہ ایسی باتوں کے سوا جو خلاف اسلام ہو سکتی ہوں فردوسی نے پورے طور پر پہلوی افسانوں کو نظم کیا اور جزئیات میں کامل مطابقت قایم رکھی ہے۔ اپنی رائے کے ثبوت میں پروفیسر موصوف نے پہلوی کتاب 'کانامک ارتخشتر پاپکان' اور شاہنامہ کے اُس حصہ کا جس میں 'اردشیر بابکان' کا بیان ہے لفظ بہ لفظ مقابلہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ دونوں کتابوں میں سرِ مو فرق نہیں ہے۔

شاہنامہ کے مطابق پیشدادی خاندان کا دور کیومرث سے شروع ہوتا ہے اور جمشید پر ختم ہوتا ہے اور اُس کا تعلق سرزمین ایران سے قایم کیا گیا ہے بعض فرنگی مورخین مثلاً سر جان ملکم نے اس دور کو ایران سے تو متعلق سمجھا ہے لیکن شاہنامہ کے اس حصہ کو افسانہ سے زیادہ قرار نہیں دیا ہے اور اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب اہلِ ایران حالتِ وحشت سے گزر کر تمدن کے راستہ پر آ رہے تھے۔ ضحاک کے زمانہ کی نسبت بھی اسی طور پر صاحب

موصوف یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ عسوری سلطنت کے تسلط کا زمانہ تھا۔

محققین مابعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اس دور کے بادشاہ اور ضحاک کے بعد فریدوں و منوچہر وایرج وغیرہ کوئی تاریخی وجود نہیں رکھتے مگر یہ کہ اُن کے ناموں کا وجود ضرور اُس زمانہ سے متعلق ہے جبکہ ہندوستانی اور ایرانی شاخیں جُدا نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی توضیح اس طرح کی جاتی ہے کہ کیومرث کا نام جو اَوِستا میں گیومرتیا لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ کتاب مذکور کے جو اجزا اس وقت موجود ہیں اُن میں سے ایک حصہ کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ ۵۸۳ ق۔م اور ۱۵۰ ق۔م کے درمیان کی تصنیف ہے۔ مزید تفصیل اس کتاب کی آگے آئے گی۔ سرِدست یہاں اس قدر ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس کتاب میں گیومرتیا کو انسان اول مانا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت اَوِستا لکھی گئی اُس وقت ایران میں ایسی روایات موجود تھیں جن کے مطابق گیومرتیا یا کیومرث بمنزلۂ آدم مانا جاتا تھا۔ بعد میں اس روایت نے وہ شکل اختیار کی جس میں کیومرث ایران کا پہلا بادشاہ بن گیا۔ اسی طرح جمشید کی کیفیت ہے۔ پروفیسر ہاون لکھتے ہیں کہ یہ نام خورشید کی طرح مرکب ہے الفاظ 'جم' اور 'شید' سے۔ اور 'شید' ماخوذ ہے زبانِ اَوِستا کے لفظ 'شیتا' سے جس کے معنی سردار۔ بادشاہ اور روشن کے ہیں۔ پس اصل لفظ یا نام 'جم' باقی رہتا ہے۔ آوستا میں اس نام کو یِم اور سنسکرت میں یَم لکھا گیا ہے۔ ہندوستانی افسانوں میں 'یم' وہ پہلی بزرگ مگر فانی شخصیت ہے جو بحالت حیات عالم ارواح میں پہونچی اور آوِستا کے مطابق 'یِم' ابن 'وِوَان ہو' ایک خوشرو نوجوان ہے جس نے اہورمزد کی پیغمبری قبول نہیں کی مگر بالآخر چار گوشۂ ورن (غالباً کوہ البرز کے آس پاس کا علاقہ) کی تعمیر پر مامور ہوا شاہنامہ میں یہ ایک ایسے عظیم الشان بادشاہ کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے جس نے اہل ایران کو چار طبقوں پر منقسم کیا۔ عمارات اور شہر تعمیر کئے۔ جشن نوروز قایم کیا اور ہوائی تخت پر بیٹھ کر فضا میں سیر کی۔ اور آخر کار ضحاک کے ہاتھوں اپنے تکبر کا شکار ہوا۔ ضحاک کو شاہنامہ میں عربی النسل بادشاہ ظاہر کیا گیا ہے جس کے کاندھوں پر شیطان کی اغوا سے دو سانپ نمودار ہو گئے تھے اور جس نے گوشت خوری کا آغاز کر کے اپنے ظلم و تعدی سے اہل ایران کو پریشان کر دیا تھا۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ اہل مشرق ضحاک کو عربی لفظ سمجھ کر اُس کے معنی مسخرے یا ہنسنے والے کے لیتے ہیں لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ صاحب موصوف یہ خیال کرتے ہیں کہ فردوسی نے ضحاک نام کا ظالم اور عربی النسل بادشاہ بنا کر اُن ایرانی جذبات کا اظہار کیا ہے جن سے ایرانیوں کے دل اہل عرب کے خلاف بھرے پڑے تھے۔ جیسا کہ فردوسی کے مندرجۂ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:۔

ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید ست کار
کہ تختِ کیاں را کند آرزو — تفو بر تو ای چرخِ گردان تفو

صاحب موصوف بیان کرتے ہیں کہ کتاب آوِستا میں قدیم روایتوں کی بنا پر ایک ایسے سانپ کا ذکر ہے جس کے سر پر دو سانپ اور نکلے ہوئے تھے۔ اُس کا نام اژی دہاک تھا جو مائی تھالوجی کے سلسلہ میں ضحاک ہو گیا اور معمولی زبان میں اژدہا رہ گیا۔ دیگر آریہ شاخوں میں تین تین سر والے اژدروں کے قصے پائے جاتے ہیں چنانچہ یہی لفظ سنسکرت میں آہی دَہک کی شکل میں موجود ہے۔ 'اہی' بمعنی افعی اور 'دہک' کاٹنے والا۔ فریدوں بھی جم و ضحاک کی طرح ہند و ایران کی مشترک فرضی شخصیت مانی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اہلِ تحقیق کے نزدیک پیشدادی خاندان اور اُس کے بادشاہ حقیقت میں کوئی وجود نہیں رکھتے۔ نہ صرف یہ بلکہ کیانی خاندان اور کیانی بادشاہوں کا بھی کوئی تاریخی وجود تسلیم نہیں کیا جاتا اور شاہنامہ میں کیقباد سے لیکر گشتاسپ و اسفندیار تک جسقدر احوال بیان کیا گیا ہے اُس کو افسانۂ دیرینہ سے زیادہ وقعت نہیں دیجاتی۔ رستم اور اُس کے خاندان کو شاہنامہ میں کیانی بادشاہوں کے خاندان کے احوال سے وابستہ رکھا ہے لیکن اَوِستا میں رستم یا خاندانِ رستم کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اس سے قیاس کیا گیا ہے کہ آوِستا کی تصنیف کے زمانوں میں اور اُس علاقہ میں جہاں آوِستا کی تصنیف ہوئی یا جاری رہی رستم پہلوان کے خاندان کے متعلق کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ اِن روایتوں کی پیدائش کسی مابعد زمانہ سے اور علاقۂ پارس و سیستان سے متعلق سمجھی جاتی ہے یعنی یہ کہ رستم کی داستان اُس مائی تھالوجی کی ذیل میں نہیں آتی جو ہند و ایران میں ورود سے پہلے آریہ اقوام کی مشترک سرمایہ تھی۔ رستم کے متعلق مقامی روایات کے وجود کو قیاساً تسلیم کیا جاتا ہے لیکن زال و رستم کا کُل افسانہ خود فردوسی کے بیان کے مطابق فردوسی کی شاعری کا نتیجہ مانا جاتا ہے۔

نہفتہ کردہ ام رستمِ پہلوان — وگرنہ یلے بود در سیستان

بعض صاحبان نے کیانی خاندان کے بادشاہوں کی اُن بادشاہوں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جن کے تاریخی حالات یونانی اور دیگر مورخین کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں۔ مثلاً قوم میڈ کے متعلق اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ایران کی یہ پہلی آریہ قوم ہے جس کے بادشاہوں کا تاریخی حال معلوم ہوا ہے۔ نقشہ و بیان مندرجۂ ذیل سے ظاہر ہوگا کہ قوم میڈ کے بادشاہوں اور کیانی بادشاہوں کے ناموں میں کس طور پر تطبیق کی گئی ہے:۔

شمار	شاہنامہ کے مطابق	مورخ ہرادتوس کے مطابق	مورخ ٹے سیس کے مطابق	مورخ موسی کے مطابق	کتب یہود کے مطابق	مدتِ حکومت
۱	فریدون	آربسیس	آربسیس	ورنبسیس	اسیورس	۱۸ برس
۲	منوچہر		من داسیس	من داسیس		۱۵ برس
۳	نوذر		سوزرمس	سوزرمس		۷ سال مطابق فردوسی
۴	زد		اریتا	ارتوکس		۵ برس مطابق فردوسی
۵	گرشاسپ	بدنظمی کا زمانہ	اربیانس	کارڈسیس		۹ برس مطابق فردوسی
۶	کیقباد (ارش)	دیوسیس (دیاکو)	ارسیس	دیوسیس	ارفخشد	۵۴ سال مطابق ٹے سیس
۷	افراسیاب	فرارتس	ارٹائنس	ارٹونس		۳۲ سال مطابق ہرادتوس
۸	کیکاؤس	سیاک زرس	ارتی برس	کیک زرس		۵۴ سال ایضاً
۹		استاجس	اسپدان	استاجس	ڈرائس قوم میڈ	۳۵ سال

جو صاحبان شاہنامہ کے ناموں کی یونانی مورخوں کے نوشتہ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ ضحاک، عسوری سلطنت کے اُس بادشاہ کا نام تھا جس نے میڈیا کو فتح کیا تھا اور یہ کہ ضحاک کی مدتِ حکمرانی سے وہ سارا زمانہ مراد ہے جو عسوری سلطنت کی ماتحتی میں اہلِ میڈیا کا گزرا۔ عسوری سلطنت سے تقریباً ۷۰۰ ق۔م کے آس پاس آزادی حاصل کی گئی اور اُسی زمانہ میں بادشاہ اربسیس تھا۔ اس لئے یہ قیاس کیا گیا ہے کہ اربسیس ہی وہ بادشاہ ہے جس کو شاہنامہ میں افریدوں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مزید تائید میں درفش کاویانی کی شہادت پیش کی جاتی ہے۔ کاوہ نے جب ضحاک سے بغاوت کی تھی تو ایک چمڑے کا جھنڈا بھی طیار کیا تھا جس کو بعد کے ایرانی بادشاہوں نے زر و جواہر سے مرصع کیا۔ اس جھنڈے کے نام سے اور اس امر سے کہ یہ جھنڈا اہلِ عرب کی فتح کے وقت موجود ہونا بیان کیا جاتا ہے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ شاہنامہ کا وہ بیان جو فریدوں کی ضحاک پر کامیابی سے متعلق ہے قرینِ صحت ہے۔

فریدوں کے بعد دوسرا بادشاہ جس کی مطابقت کی جاتی ہے کیقباد ہے۔ مطابقت کی دلیل یہ ہے کہ شاہنامہ کے بیان کے مطابق زو اور گرشاسپ کا زمانہ وہ تھا جبکہ افراسیاب نے ایران کو اپنا ماتحت بنالیا تھا اور ایران کی حالت ابتر ہوگئی تھی۔ ہرادتوس نے بھی اُس زمانہ کے حالات کو بدنظمی کا زمانہ تحریر کیا ہے۔ اس بدنظمی کے عالم میں رستم و زال نے بقول مصنفِ شاہنامہ بزرگانِ ایران سے مشورہ کرکے کیقباد کو علاقۂ البرز سے تلاش کرکے بادشاہ بنایا۔ ہرادتوس کا بھی یہی بیان ہے کہ بدنظمی کی وجہ سے اہلِ میڈیا نے دیوسیس کا انتخاب کیا۔ دوسری مطابقت یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ یونانی اور ایرانی کتابوں میں اس بادشاہ کا دوسرا نام ارش یا ارس لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔

اسی طرح سیاک زر (ہوخشتر) کو کیکاؤس قرار دیا جاتا ہے۔ شاہنامہ میں کیکاؤس، ہاماوران پر حملہ کرکے اُس کو فتح کرلیتا ہے۔ ہاماوران کو سامی ممالک کا کوئی حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ تاریخی واقعہ یہ ہے کہ سیاک زر نے اہلِ بابل سے ملکر عسوری سلطنت کے پایۂ تخت نینوا کو تباہ و برباد کرکے سلطنت مذکور کا خاتمہ کردیا اور عسوری شہزادی سے شادی بھی کرلی۔ شاہنامہ میں بھی ہاماوران کی شہزادی سے کیکاؤس کا عقد ہونا بیان کیا گیا ہے۔

یونانیوں کے نزدیک قوم میڈ کا اخیر بادشاہ استاجس ہوا۔ اس بادشاہ کو علاقۂ پارس کے بادشاہ سائرس (کروش یا کرویا کورس) نے زیر کرکے سارے ایران پر قبضہ کرلیا اور اخمنی سلطنت کی بنیاد قائم کی۔ مطابقت کرنے والے اصحاب اس بادشاہ یعنی کروش کو کیخسرو ظاہر کرتے ہیں اور وجہ مطابقت

یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس طرح شاہنامہ میں کیخسرو کا کیکاؤس کا پوتا اور افراسیاب کا نواسہ ہونا اور اُس کا توران میں افراسیاب کے سپہ سالار کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانا مذکور ہے اُسی طرح یونانی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ کروش نواسہ تھا استاجس کا۔ استاجس نے ایک موحش خواب دیکھا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے نواسہ سے خائف رہتا تھا اور بالآخر اُس نے اپنے نواسہ کو بغرض ہلاکت اپنے سپہ سالار کے سپرد کر دیا تھا۔ لیکن سپہ سالار مذکور نے بچہ کو ہلاک کرنے کے بجائے اُس کی خفیہ پرورش کی اور جب کروش جوان ہو کر استاجس سے لڑا تو وہ سپہ سالار کروش سے مل گیا۔ مطابقت کرنے والے اس سپہ سالار کو وہی پیران ویسہ قرار دیتے ہیں جو افراسیاب کا جنرل تھا اور جس نے کیخسرو کی پرورش کی تھی، اسی طرح کیخسرو اور کروش کے اُن حالات میں بھی کچھ یکسانیت ہے جو اُن کی موت سے متعلق ہیں۔ اس تطبیق سے ایک مشابہت اور پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ افراسیاب جس کو شاہنامہ میں ترکوں کا بادشاہ ہونا بیان کیا گیا ہے اور جس کا ایرآن کو گاہے بگاہے فتح کر لینا بھی مذکور ہے وہی استاجس اور قوم میدؔ کے دوسرے بادشاہ ہیں جن کی حکومت علاقۂ پارس میں رہی

باایں ہمہ محققینِ حال شاہنامہ کے پیشدادی اور کیانی بادشاہوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ پیشدادی خاندان کے قصوں کو تو اُس زمانہ کی روایات سے منسوب کرتے ہیں جو ہند و ایرآن سے باہر اقوام آریہ کا بسر ہوا۔ اور کیانی بادشاہوں کے تذکرہ کو محض افسانہ قرار دیتے ہیں اور صرف اس قدر ممکن خیال کرتے ہیں کہ شاہنامہ میں جن ایرانی و تورانی لڑائیوں کا ذکر ہے اُن سے وہ جنگیں مراد ہیں جو قوم میدؔ کے ایرآن میں وارد ہونے کے زمانہ میں آذربائجان اور رے کے علاقوں میں قوم میدؔ اور علاقجات مذکور کے ترکی النسل فرقوں کے درمیان ہوئیں۔ یا وہ خونریزیاں مراد ہیں جو قوم میدؔ کے بادشاہوں اور پارس کے اخمنی بادشاہوں سے ہوئیں۔ یا وہ لڑائیاں ہیں جو زردشت کے زمانہ میں بلخ (باختر) کے بادشاہوں اور دریائے جیحون کے اُس پار رہنے والی ترکی اقوام سے باہم ہوئیں۔ اسی طرح محققین اس امر کے قیاس کرنے کی اجازت دیتے ہیں کہ ضحاک کی حکومت سے عسوری سلطنت کی حکومت مراد لی جا سکتی ہے۔ زیادہ کچھ نہیں۔

خلاصہ کے طور پر دورِ اول کی یادگار میں صرف وہ الفاظ سمجھے جاتے ہیں جو فارسی و سنسکرت میں مشترک ہیں اور وہ روایات ہیں جو بدلی ہوئی شکلوں میں مثل کیومرث۔ جمشید۔ ضحاک و فریدوں وغیرہم کی داستانوں کے ہند و ایرآن میں اب تک رائج و شایع ہیں یا ایسی مذہبی رسوم ہیں جیسی زنار بندی یا آتش پرستی وغیرہ۔

دوسرا دور باعتبار تاریخی معلومات کے دوسرا دور ایرانی حالات کا وہ قرار دیا گیا ہے جس میں میدیا اور علاقۂ پارس بابلی اور عسوری سلطنتوں کی ماتحتی میں رہے۔ اس زمانہ کے تفصیلی حالات کے متعلق کوئی معلومات نہیں بجز اُن واقعات کے جو عسوری کتبوں سے ظاہر ہوتے ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ البتہ یہ ضرور پایا جاتا ہے کہ جہاں تک زبان اور شاہانہ مراسم کا تعلق ہے عسوری زبان اور عسوری سلطنت نے ایران کی زبان اور شاہی رسم و رواج پر بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔ قدیم فارسی حروف تہجی عسوری رسم الخط سے اخذ کئے گئے اور سامی زبانوں کے بہت سے الفاظ قدیم فارسی زبان میں اس طور سے داخل ہو گئے کہ لکھنے میں تو الفاظ وہی لکھے جاتے تھے جیسا سامی زبانوں میں اُن کا تلفظ ہوتا تھا لیکن پڑھا جاتا تھا اُن کو ایرانی زبان میں۔ مثلاً الفاظ تو 'ملکان ملک' لکھے جاتے تھے مگر یہی الفاظ شہنشاہ پڑھے جاتے تھے۔ گویا سامی الفاظ کا جو مفہوم ہوتا تھا، اُس کو ایرانی زبان میں ترجمہ کر کے پڑھا جاتا تھا۔ شاہانہ رسم و رواج کا یہ اثر ہوا کہ جس طرح عسوری بادشاہ اپنے آپ کو شاہِ شاہان وغیرہ سمجھتے تھے اور خدائی صفات و القاب سے خود کو متصف کرتے تھے اُسی کی نقل ایرانی بادشاہوں نے بھی اُتاری۔

(باقی)

سید حکیم احمد نقوی

تذکرۂ معرکۂ سخن

اپنے رنگ کا بالکل پہلا تذکرہ، جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ کے کلام پر کیا کیا اعتراض کئے اور یہ کہ ان کا کوئی جواب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ تذکرہ انتہائی کاوش کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور فن شعر کے متعلق بے بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ/۸)

منیجر نگار لکھنؤ

یوروپ میں اشتراکیت کی جدوجہد

یوروپ میں اشتراکیت کی عملی تاریخ کا سلسلہ ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتا ہے مگر اس سے پہلے فرانس میں سینٹ سیمون و فوریہ اور انگلستان میں
و برٹ اون وغیرہ نے اشتراکی خیالات کی تبلیغ اور اقتصادی تحریک کی تنظیم شروع کردی تھی چنانچہ انگلستان کی لبرل پارٹی کی ابتدا رابرٹ اون کی طرف منسوب
ی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۴۸ء میں جب کارل مارکس نے ایک "جماعتی بیان" شایع کیا اسوقت سے اشتراکیت ایک مکمل اُصول اور لائحۂ عمل کے
ساتھ دنیا کے سامنے آگئی چنانچہ ۱۸۴۸ء اور اس کے بعد یورپ میں جو کشمکش ہوئی اس کی بنیاد یہی اشتراکیت تھی، جرمنی اور فرانس میں اشتراکیوں نے
س کی کوشش کی کہ لیڈری کی باگ ڈور متوسط طبقہ کے ہاتھوں چھن جائے مگر چونکہ اسوقت انگلستان کے علاوہ یوروپ کے کسی ملک میں صنعت و حرفت نے
تنی ترقی نہیں کی تھی کہ مزدوروں کی طاقت ایک منظم اشتراکی تحریک کو چلانے کے لئے کافی ہوتی اس لئے یہ جدوجہد ناکام رہی اور اشتراکی حریت پسندوں کو
ہر جگہ ناموافق حالات سے دوچار ہونا پڑا -

پچھلی نصف صدی میں اشتراکیت کی اس ناکامی سے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب اس کی ترقی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی مگر کچھ ہی عرصہ بعد اشتراکی لیڈروں نے پھر
اس تحریک کو زور و شور کے ساتھ شروع کیا اور لندن کا شہر جلاوطن اشتراکیوں لیڈروں کا ایک پناہ گاہ ہوگیا جہاں کارل مارکس کی سربراہی میں اشتراکیوں
کی بڑی جماعت موجود تھی -

اس کے بعد ۱۸۶۴ء میں جب پہلی مزدور پارٹی[1] قائم ہوئی تو اشتراکی لیڈروں نے اپنی ساری کوشش اس بات پر صرف کردی کہ یورپ کے مختلف ملکوں
خصوصاً جرمنی اور فرانس میں باضابطہ اشتراکی جماعتیں قایم ہوجائیں - چنانچہ جرمنی میں ایک طویل عرصہ کی جدوجہد کے بعد ایک جمہوری اشتراکی جماعت قایم
ہوئی جس کے بہت سے اُصول موجودہ جرمنی میں رائج ہیں - یہ جمہوری اشتراکی پارٹی شہنشاہیت کے زوال کے بعد سے برابر جرمنی حکومت میں نمایاں رہی ہے لیکن
جب ہر ہٹلر نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت پارٹی کا شیرازہ بکھر کر نیشنل سوشلزم میں مل جل گیا اور آج سارا جرمنی اسی وطنی اشتراکیت کا پرستار ہے

فرانس میں اشتراکیت کا دو بڑی طاقتوں سے سامنا ہوا، ایک براڈلون کے متبعین کی جماعت تھی جو قریب قریب انارکسٹ تھے اور ہر اجتماعی مسئلہ کو اشتراکیت
کے اصول سے بالکل مختلف طریقے پر جانچنے کے عادی تھے - دوسری طاقت بلانکی کے متبعین کی تھی جو اگرچہ کارل مارکس کی رائے سے بڑی حد تک متفق تھی مگر ان کا
میلان زیادہ تر انقلاب اور بغاوت کی طرف تھا -

اسی طرح اٹلی میں بھی اشتراکیت کے لئے راستہ صاف نہ تھا کیونکہ وہاں ایک طرف اس کی مخالف ماٹوزینی کے متبعین کی جماعت تھی، دوسری طرف ایک دوسری
پارٹی تھی جو بکین روی کے انارکسٹانہ خیالات سے متاثر تھی - تقریباً ایسے ہی حالات روس میں بھی پیدا ہوگئے تھے اس لئے کہ اشتراکیوں نے وہاں صنعتی کارخانوں کی
عدم موجودگی میں کسانوں کو ورغلانا چاہا اور اس کے لئے ان کی نگاہ میں مارکس کے نظریات سے انارکزم کی راہ بہتر تھی -

لیکن ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں روس اور فرانس کی جنگ میں نپولین کی ناکامی کے بعد فرانس میں کمیونسٹوں نے زور پکڑا جس سے ان کو حکومت میں
دخل حاصل ہوگیا تو اس وقت بین الاقوامی مزدور پارٹی کو یورپ میں ایک بلند مقام حاصل ہوگیا - فرانس میں اس اشتراکی حکومت کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی
کیونکہ اول تو یہ حکومت مختلف عقیدوں کے لوگوں کا مجموعہ تھی، دوسرے ان لوگوں نے چند ایسی کارروائیاں کیں جن سے فرانسیسی قوم بگڑ گئی اور

---

[1] یہ بین الاقوامی مزدور پارٹی اپنی یورپین تاریخ میں اسی "پہلی پارٹی" کے نام سے موسوم ہے تاکہ دوسری اور تیسری بین الاقوامی پارٹی میں ممیز ہوسکے جنکا بیان آگے آئیگا

اس نے موسیو پیرس کی تائید شروع کردی جس کی وجہ سے فرانس میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جو تقریباً دو ماہ تک (از اپریل تا ۲۸ مئی ۱۸۷۱ء) جاری رہی، اس میں کمیونسٹ پارٹی کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھوں سے حکومت چھن گئی، اب فرانسیسی جمہوریوں کا راستہ صاف ہوگیا، انھوں نے تیسری بار پھر جمہوری حکومت قایم کی جس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ حکومت متوسط طبقہ کی حکومت ہوگی چنانچہ فرانسیسی حکومت کی یہ خصوصیات کے ساتھ قایم رہیں۔

فرانس کی پہلی اشتراکی حکومت کے ٹوٹ جانے کے بعد اشتراکی لیڈروں کے حوصلے پست ہوگئے اور یورپ میں اشتراکیت کی حیثیت محض ایک قومی تحریک کی سی ہوکر رہ گئی اور مختلف ملکوں میں اسے عروج و زوال کی منزلوں سے گزرنا پڑا چنانچہ جب جرمنی میں کارل مارکس کے نظریے رواج پذیر ہو رہے تھے اسوقت پرنس بسمارک اس کی مخالفت پر مستعد ہوگئے اور انھوں نے اسے سخت سے سخت قوانین میں جکڑ دیا جس کا سلسلہ تقریباً ۱۸۷۰ء سے لیکر ۱۸۹۰ء تک رہا اور جس کی وجہ سے اشتراکی جرمنی سے نکلنے پر مجبور ہوئے لیکن باہر جاکر بھی یہ لوگ اپنی تحریک چلاتے رہے اور بالآخر ان کی کوششوں سے اسے جرمنی میں فروغ حاصل ہوا اور وہاں کی جمہوری اشتراکی پارٹی نے ۱۸۹۱ء میں قومی سیاست کے اندر ایک نمایاں جگہ حاصل کرلی۔ اسی سال سے جرمن اشتراکی، جرمن پارلیمنٹ ریشٹاک (Riechstag) میں اپنی نشستوں کی زیادتی کے لئے بہت سرگرمی سے کام لینے لگے مگر اس سے پارٹی کے مقاصد میں بہت کچھ انقلاب آگیا اور یہ جماعت ایک دم اعتدال پسند ہوکر رہ گئی۔ اس انقلاب کا بڑا باعث ایڈورڈ برنسٹین تھا گو برنسٹین اور اس کے ہمخیال رفیقوں کو ۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں پارٹی سے علٰحدہ کردیا گیا مگر اس کے موئدین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وجہ سے پارٹی کے اُصول میں اہم تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ اور اس کا مقصد انقلاب کے بجائے اصلاح ہوگیا یعنی اس جماعت کی رگ رگ میں اعتدال پسندی سرایت کرگئی۔ یہ وہی جرمنی کی اشتراکی پارٹی ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے کرچکے ہیں۔

انگلستان میں بھی گزشتہ صدی کے آخری حصہ میں لبرل صیغوں کے قیام کا رجحان پیدا ہوچلا تھا مگر آگے چلکر جب اقتصادی اُلجھنیں بڑھ گئیں تو یہ تحریک کمزور پڑگئی اور اس کی جگہ پر مزدور اپنی اُلجھنوں سے گھبراکر ایک ایسی جماعت کے طالب ہوئے جس کے مقاصد و مطالبات کافی وسیع ہوں چنانچہ لیبر پارٹی وجود میں آئی جس کی مزدوروں نے پوری تائید کی، اور چند ہی سال میں اس کو تقویت حاصل ہوگئی کہ اس کے نمایندے پارلیمنٹ کے انتخاب میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہونے لگے۔ تاہم بعض لوگوں نے اس سے بڑھکر مارکزم کے اُصولوں پر ایک اشتراکی جماعت قایم کی مگر مزدوروں نے اس کے متعلق کوئی گرمجوشی نہیں دکھلائی جس کی وجہ سے اس تحریک میں کوئی زور پیدا نہیں ہوا۔ پھر جب بیسویں صدی کے شروع میں مسٹر گیرارڈی کی رہنمائی میں مزدور پارٹی ازسرِنو مرتب ہوئی تو اس سے اشتراکی پارٹی کو بہت ٹھیس لگی اور اس کی قوت اور بھی کمزور ہوگئی۔ یہ مزدور پارٹی یورپ کی دوسری اشتراکی جماعتوں سے بالکل مختلف تھی اور گو وہ بعض اشتراکی اُصولوں سے متفق تھی مگر اشتراکیت سے اس کا راستہ کوسوں دور تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ مشکلات کی اصلاح کیجائے نہ اشتراکی ہنگامہ آرائی کے ذریعہ، یہ حربے حقیقی اصلاح کے لئے بالکل بے سود ہیں۔

مگر روس کے حالات جرمنی اور انگلستان سے مختلف تھے اس لئے کہ روس اشتراکی وہاں ظلم و تشدد اور جلاوطنی وغیرہ کا ہمت و استقلال سے مقابلہ کرتے رہے، بڑے بڑے اشتراکی رہنماؤں کو سائبیریا اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں جلاوطن کردیا گیا مگر اس تحریک کی آگ برابر مشتعل رہی، آگے چلکر جب ۱۹۰۵ء کے اہم انقلاب میں اشتراکی ناکام رہے تو ان کے اوپر مصائب و مظالم کا انبار اور بھی زیادہ ہوگیا جس کی بدولت ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ روس کی اس اشتراکی تحریک کو باہر سے تقویت دیں۔

ان مظالم کے علاوہ اسوقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں میں منقسم تھے، ایک پارٹی کا مقصد کاشتکاروں کی اصلاح تھا مگر چونکہ ان کے نزدیک انقلاب کے بغیر کاشتکاروں کی اصلاح نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے ان کا رجحان انارکزم کی طرف تھا اور وہ بیکن روسی کے خیالات سے زیادہ متاثر تھے ایک دوسری جماعت کارل مارکس کی پیرو تھی ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں اس کے دو حصے ہوگئے، ایک بالشویزم کی جماعت تھی جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سے اس وقت تک روسی اشتراکیت کے نام سے موسوم ہے اور دوسری جماعت کارل مارکس کے اُصول کی پیرو ہونے کی دعویدار تھی مگر درحقیقت اس کا خیال یہ تھا کہ روس میں اشتراکیت اس وقت قایم ہوسکتی ہے جب متوسط طبقہ سے تعاون کرکے پہلے ایک جمہوری حکومت قایم کرلی جائے، یہ بالشویزم کی انقلاب پسندی اور تدریجی تبدیلی کے بجائے فوری عروج کی مخالف تھی اور اس کے نزدیک یک بیک اشتراکیت کا قیام ایک ناممکن وہم و گمان تھا۔

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلی بین الاقوامی مزدور پارٹی ۱۸۶۴ء میں قایم ہوئی مگر فرانس کی اشتراکی حکومت کی ناکامی کے بعد آہستہ آہستہ فنا ہو گئی، ن ۱۸۸۹ء میں اشتراکی جماعتوں نے ملکر ایک دوسری بین الاقوامی قائم کی جو دوسری بین الاقوامی پارٹی یا بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ عت پہلی بین الاقوامی جماعت سے مختلف تھی کیونکہ اُس کے پاس کوئی ہمہ گیر مرکزی نظام نہ تھا بلکہ اس کی توجہ صرف اس بات پر محدود تھی کہ مختلف اشتراکی ھتوں کو کس اسلوب اور کس طرح چلایا جائے مگر اس دوسری پارٹی نے ۱۹۱۱ء تک اس مسئلہ کو بھی اپنے سامنے رکھا کہ امن و جنگ کے بارے میں کیا رویہ یار کیا جائے اور اس میں اشتراکیوں کی کیا حیثیت ہو؟ یہ موضوع امسٹرڈم (ندرلینڈ) کی ۱۹۰۴ء کی کانفرنس کا خاص موضوع تھا چنانچہ فرانسیسی تراکی جورز نے 'نئی فوج' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ مگر اسٹیٹگرٹ (جرمنی) کی دوسری کانفرنس میں ہرفیہ نے نیشنلزم اور وطنیت کی صدا بلند کی، اور ں میں جرمنی کے دو لیڈروں (سبیل و فولجار) نے صاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کر دیا کہ اگر جرمنی پر حملہ ہوا تو جرمنی کی جمہوری اشتراکی پارٹی ے سے پہلے اس کی مدافعت میں حصہ لے گی۔

اس کے بعد جب ۱۹۱۱ء میں یورپ کی فضا بہت مکدر ہو گئی تو ۱۹۱۲ء میں اشتراکی لیڈروں نے بین الاقوامی تعلقات پر غور فکر اور اپنی امن پسندانہ یسی کی وضاحت کے لئے یکجا ہو کر ایک اہم ریزولیوشن پاس کیا کہ دُنیا کے تمام مزدور اپنی اپنی ملکی حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ اپنی خارجی پالیسی امن پسندی صول کی بنیاد پر کرے تاکہ دُنیا عالمگیر جنگ سے باز رہے۔ امن پسندی کی یہ صدائیں تمام ممبروں کی زبانوں سے بلند ہو رہی تھیں اور ۱۹۱۴ء میں ایک کانفرنس منعقد ہونے کی تجویز تھی مگر جنگ چھڑ جانے سے سارا پروگرام یکایک معطل ہو گیا اور کانفرنس نہ منعقد ہو سکی۔

اس جنگ سے اشتراکیوں کا شیرازہ بالکل بکھر گیا، ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اشتراکیوں نے جنگ کو روکنے کی بڑی کوشش کی تھی مگر ۱۹۱۴ء موسم گرما میں یورپ کی حکومتیں باہم دست و گریباں ہو گئیں تو ہر اشتراکی پارٹی اپنے بین الاقوامی جماعت کے فیصلہ کے خلاف اپنی قومی حکومت ائید میں مشغول ہو گئیں۔ مگر اس کے باوجود اسوقت چند ایسے اشتراکی موجود تھے جنھوں نے اپنی قومی حکومت کے جنگی رویہ سے اختلاف کر کے اسے ے روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ یاد ہوگا کہ فرانسیسی اشتراکی لیڈر موسیو جورز نے فرانسیسی حکومت کی اس بارے میں مخالفت کی تھی جسکا اسے موت کی شکل میں حاصل ہوا تھا، اسی طرح مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے بھی انگلستان کے جنگی رویہ پر اعتراض کیا تھا مگر اس پر چنداں دھیان یں دیا گیا البتہ اس سلسلہ کا ایک پر لطف واقعہ یہ ہے کہ جب مسٹر میکڈانلڈ بین الاقوامی اشتراکی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایک انگریزی جہاز فر کرنے والے تھے تو اس جہاز کے سارے نوکروں نے اس جہاز میں کام کرنے سے انکار کر دیا جس پر مسٹر میکڈانلڈ سوار ہوں۔ لیکن درحقیقت بہت کم بین الاقوامی اشتراکی کانفرنس کے نقطۂ خیال پر ثابت قدم رہے یا اشتراکی تحریک کے بین الاقوامی پہلو کو اپنی قومیت پر ترجیح دی اور اسکے فیصلہ کو ں احترام سمجھا بلکہ اس جنگ میں عموماً ہر شخص اپنی قومیت پر قربان ہوا اور سبھوں نے جنگ میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ فرانس اور برطانیہ کی اشتراکی ٹیاں جنگی وزارتوں سے ملکر پوری طرح سرگرم کار رہیں اور اگر جرمن حکومت جرمنی کی اشتراکی پارٹی کو وزارت میں دعوت دیتی تو وہ یقیناً اس سے ار نہ کرتی، مگر اس کے باوجود بھی اس کی ہمدردی اپنی گورنمنٹ کے ساتھ تھی۔

غرض ان حالات میں جب بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کا شیرازہ بکھر رہا تھا، ستمبر ۱۹۱۵ء اور اپریل ۱۹۱۶ء میں زمرفولڈ اور کینٹال میں دو ں الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جس میں اشتراکی جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں دو قسم کے خیالات کے لوگ شریک تھے، ایک عت یہ سمجھتی تھی کہ اس کانفرنس میں جنگ کے انسداد پر زور دیا جائے گا اور دوسری جماعت یہ کہتی تھی کہ اس عالمگیر جنگ سے فائدہ اُٹھا کر ہمیں ان فرنسوں کو اشتراکیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنانا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو اشتراکیت کو ہر جگہ پھیلایا جائے۔ اس خیال کا پہلا حامی لینن تھا۔

اس کے بعد روس کی عظیم الشان اشتراکی بغاوت رونما ہوئی جو درحقیقت حکومت کے مظالم کا نتیجہ تھی۔ اس وقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں تقسم تھے، ایک پارٹی انقلاب پسند اور باغی تھی جس کا مقصد کاشتکاروں کا فلاح تھا! دوسری پارٹی مارکس کی پیروکار ہوتی تھی، اس میں بھی دو ٹیاں تھیں، ایک اعتدال پسند جو طبقۂ متوسط سے تعاون کی قایل تھی، دوسری پارٹی مزدوری کے انقلاب کی حامی اور مزدوروں کی ڈکٹیٹری کی ب تھی۔ اس وقت اسے بالشویک کے نام سے پکارا جاتا ہے مگر جب ۱۹۱۷ء میں روس کے اندر اعتدال پسند اشتراکی اور متوسط طبقہ کے

آزاد خیالوں نے بغاوت شروع کی تو سب خیال کے اشتراکیوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس انقلاب کے بعد جو وزارت قایم ہوئی اس کا وزیر اعظم کرنسکی تھا لیکن اس کے بعد جب بالشویکوں کی قیادت اور لینن کی رہبری میں دوسرے انقلاب کے شعلے مشتعل ہوئے اور ان لوگوں نے ایک مزدور ڈکٹیٹر شپ کا اعلان کیا تو یورپین اشتراکی دو جماعتوں میں منقسم ہو گئے اور دونوں میں اختلاف کی خلیج اور زیادہ وسیع اور عمیق ہو گئی۔ جب بالشویک روس کی حکومت پر پوری طرح قابض ہو گئے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہی اشتراکیت کے حقیقی پیرو ہیں اور ایک تیسری بین الاقوامی اشتراکی پارٹی قایم کی اور اپنے اصول کے مطابق دنیا کو ایک عالمگیر انقلاب کی دعوت دینے لگے جس کے اصول کارل مارکس کی کتابوں اور اس کے اس بیان سے ماخوذ ہیں جو اس نے ۱۸۴۸ء میں شایع کیا تھا تو اسوقت انھوں نے جمہوری اعتدال پسند اشتراکیوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ کارل مارکس کے نظریات کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے سرمایہ داری قایم کرنے کے لئے متوسط طبقہ سے تعاون کا ڈھونگ نکالا ہے۔ اس کا جواب جمہوری اشتراکیوں نے یہ دیا کہ خود بالشویک اشتراکیت کے اصولوں سے منحرف ہو گئے ہیں اور انھوں نے روس کی جمہوریت اور آزادی کا خاتمہ کر کے روسی عوام پر محض قوت و طاقت کے ذریعہ تسلط اور غلبہ حاصل کیا ہے۔ روس کی اس باہم کشمکش کا سلسلہ بہت طولانی ہے اور اس کا مفصل ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

روس کے حالات تبدیل ہو جانے سے اور اشتراکیت کا رخ دوسری طرف پھر جانے کے بعد بھی جمہوری اشتراکیوں نے یورپ کے دوسرے ملکوں میں اپنی جد و جہد جاری رکھی چنانچہ جرمنی میں (باوجود اس کے کہ روسی بالشوزم سے متاثر ہو کر وہاں ایک بالشویک پارٹی قایم ہو گئی تھی) جمہوری اشتراکی اپنے اصولوں پر قایم رہے۔ اسی طرح انگلستان کی بھی اشتراکی تحریک پر بالشوزم کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ فرانس میں بھی جب بعض اشتراکیوں کا میلان بالشوزم ہو چلا تھا تو جمہوری اشتراکی پارٹی کی پھر سے تنظیم کی گئی چنانچہ وزیروں کے انتخاب میں یہ پارٹی سب سے نمایاں اور سب پر فایق رہی۔ رہا اٹلی تو وہاں اسوقت تین جماعتیں ہو گئیں، ایک بالشویک دوسرے وہ جنھیں بالشویک بھی نہیں کہا جا سکتا، تیسرے وہ جو بالشوزم کے مخالف اور فاشزم کے حامی ہیں اور اب تو سارا اٹلی فیسسٹ ہے۔

صدرالدین عظیم

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور باربرداری کے جہازات بمبئی اور کراچی سے عدن۔ پورٹ سوڈان۔ جدہ اور سویز تک

مسافر اور مال و اسباب لیجاتے ہیں، نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک سفر کرتے ہیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جا سکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے:۔ ٹرنر مارلسن۔ اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶۔ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

ترہاتِ نظیری

نظیری اُن شعرائے ایران سے ہے جنھوں نے ہندوستان آکر سلاطین تیموریہ کے ابرِ کرم کے رشحات سے تمتع حاصل کیا ہے اگرچہ دربارِ اکبری میں ں کا پایہ چنداں ممتاز نہیں ہوا لیکن جہانگیر بلکہ شہزادہ مراد کی قدر افزائی نے اس کو گونہ فروغ دیا وہ ایک غزل گو شاعر تھا قصیدہ میں وہ اپنے معاصرین بہت پیچھے ہے تغزل میں وہ ایک روشِ خاص سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں ایک حد تک اس کا مذاق کامیاب ہے وہ حسن و عشق کے تعلقات سے باخبر ردات و معاملات بیان کرنے کی قوت رکھتا ہے لیکن اس حد تک جہاں عام عاشق مزاجوں کی رسائی ہے اسی وجہ سے اس کی غزل زیادہ تر عام پسند ہوتی ۔ لیکن جب وہ اسالیبِ تغزل کی دلآویزیوں سے باہر قدم رکھتا ہے تو اس کے طائرِ فکر کی قوتِ پرواز سلب ہو جاتی ہے۔ فلسفہ، عبرت، حکمت، موعظت اور رت کے مضامین اس کے یہاں محض آورد و تکلف پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ تصوف سے بیگانہ اور حقائق سے ناآشنا ہونے کے باوجود ان پر قلم اُٹھاتا ہے اور غ شکستہ بال کی طرح منھ کے بل زمین پر آگرتا ہے اسی وجہ سے اس کے کلام میں ناہمواری ہر جگہ نمایاں ہے غالباً مرزا صائب نے اس کے انداز و قوع گوئی و ما۔ نگاری پر نظر کرتے ہوئے کہا ہے ؎

صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری — عرفی بہ نظیری نرساند غزل را

س کے یہ معنی نہیں کہ فلسفہ حسن و عشق و رموزِ محبت و حقایق میں نظیری عرفی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ قصیدہ میں عرفی ایک اختراعی قوت اور طرزِ خاص رکھتا ہے س سے فیضی و ظہوری بھی قاصر ہیں۔ لیکن اس کی خود بینی و خود نمائی ہمعصر شعراء کو خیال میں نہیں لاتی وہ اساتذہ متقدمین پر بھی آوازے کستا ہے لیکن بایں نخوت واجہ صاحب کی روش کا اتباع سخت دشوار جانتا ہے ؎

برآں متبعِ حافظ رواست چوں عرفی — کہ دل بکارد و درد سخن ورسے داند

نظیری قصیدہ میں کوئی پایہ نہیں رکھتا اور غزل میں جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے جب اپنی سادہ تغزل کی روش سے علٰحدہ ہو جاتا ہے تو قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے سان الغیب حضرتِ خواجہ حافظ قدس سرہٗ کی متابعت کا اظہار کرتے ہوئے نہایت بدمزگی و بے کیفی کے ساتھ مخاصمانہ تعریضات کر کے اپنی بے مائگی کا بین ثبوت دیتا ہے۔ اعجاز موسوی کا معارضہ سحر سامری سے کرتا ہے مرزا صائب نے عموماً متقدمین اور معاصرین کا نام ادب و احترام سے لیا ہے اور ان کی غزل کا جواب دیا ہے لیکن خواجہ صاحب کی غزل پر جب غزل کہی ہے تو اس کو ترکِ ادب تصور کر کے نہایت معذرت کی ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

صائب چہ تواں کرد بتکلیفِ عزیزاں — ورنہ طرزِ خواجہ شدن بے بصری بود

یعنی لوگوں کے اصرار سے یہ جرأت کرنا پڑی کہ خواجہ کی غزل پر غزل لکھی ایک اور مقطع میں کہا ہے ؎

رواست صائب اگر نیست ازرہ دعوے — متبعِ غزلِ خواجہ گرچہ بے ادبی ست

کچھ صائب ہی پر موقوف نہیں ہے تمام اربابِ فن خواجہ کا اعتراف کرتے ہیں ان کے تقدم کے معترف ہیں اور بہت ہی ادب سے ان کا نام لیتے ہیں خود نظیری نے اس سنت کا اتباع کیا ہے وہ کہتا ہے ؎

تا اقتدا بحافظِ شیراز کردہ ام — گردیدہ مقتدائے دو عالم کلام ما

غالباً قبولیت عام حاصل کرنے کے لئے خواجہ صاحب کی پیروی کا دعوے کیا گیا ہے ورنہ حقیقتاً نظیری اپنے کو خواجہ صاحب کا حریف سمجھتا ہے مضامین میں مجادلہ و مکابرہ کی صورت اختیار کرتا ہے اور جوشِ مخالفت میں دائرۂ تغزل سے باہر ہو جاتا ہے۔ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے ہم اس دیدہ دلیری کی چند مثالیں پیش

کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اس کا نصب العین تعزل و تفنن نہیں ہے بلکہ صرف خواجہ صاحب کے کلام پر نقص وارد مقصود ہے۔ سنئے خواجہ صاحب کہتے ہیں ؎

ہنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی — کیں کیمیائے ہستی قارون کند گدارا

عیش و مستی کی تعلیم خواجہ صاحب کا خاص مذاق ہے وہ افکار و علائق کو منزل اُلفت میں سالک کے لئے خار راہ سمجھتے ہیں اُن کے نزدیک افلاس و تنگدستی مسرت روحانی و کیفیت وجدانی کی راہ میں حائل نہیں، مادی و دنیوی آلام و محن میں دامن اُلجھانا تجرد کے خلاف ہے لیکن بیچارہ نظیری اپنی پست فطرتی سے مجاز کے خارستان میں اُلجھا ہوا رموز حقیقت سے بیخبر، اس نظریہ کے سمجھنے سے قاصر رہا، مخالفت کے جنون میں جامہ سے باہر اور تنزل سے بیگانہ ہوکر خواجہ کے رد پر آمادہ ہوگیا اُسکو اپنی تضحیک کا خیال بھی دامنگیر نہ ہوا کہتا ہے ؎

با فقر و تنگدستی شوم ست عُجب و مستی — در کشور غیوراں نخوت کشد گدارا

یعنی فقر و ناداری میں مستی ادبار ہے اور نخوت گدا کے لئے موجب ہلاکت ہوتی ہے ۔ اکثر شعرائے متصوفین فرقہ جبریہ کے اعتقاد کے مطابق افعال و اعمال بشری کو تضاد قدر کی جانب منسوب کرکے عوام طعنہ گویوں کی زبان بند کرتے ہیں نیز اسباب و وسائط قریبہ کو نظر انداز کرکے مبدأ اول پر نظر ڈالتے ہیں اور یہ فنا کی ایک منزل ہے جسکو ہمہ اوست یا ہمہ از وست سے تعبیر کرتے ہیں اسی رمز کو خواجہ صاحب اپنے الفاظ میں یوں بیان فرماتے ہیں ؎

در کوئے نیکنامی مارا گزر ندادند — گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

مطلب یہ ہے کہ نیکنامی سے ہم کو کچھ حصہ نہیں ملا لیکن اگر تجھ کو یہ حالت ہماری پسند نہیں ہے تو تو ہماری قسمت کو پلٹ دے ۔ نظیری اس پر سخت برہم ہوتا ہے اور سطحی نظر سے نغمہ خارج از آہنگ الاپتا ہے ؎

بر قدر قابلیت دادند ہر چہ دادند — حق راست بر تو حجت تہمت مکن قضارا

کوتاہ بینی سے اس کو یہ نظر نہ آیا کہ استعداد و قابلیت بھی اُدھر ہی کا عطیہ ہے لہٰذا حجت تمام نہیں ہوئی اور قضا پر تہمت قایم ہے نظیری کا یہ فلسفیانہ استدلال بالکل بادر ہوا ہے خواجہ صاحب کا مطمح نظر خلاق عالم کی قدرت کاملہ و مشیت ازلی ہے وہ ایک ذرۂ کائنات کو بھی خداوند تعالیٰ کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں جانتے اور اسی بنا پر اپنی مجبوری کا عذر پیش کرتے ہیں ۔ اخلاق و موعظت جو خواجہ صاحب کی جولانی فکر کا میدان ہے اس میں فرماتے ہیں ؎

دہ روزہ مہر گردوں افسانہ ایست افسوس — نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

کہتے ہیں کہ "چند روزہ زندگی یا فرصت کو غنیمت سمجھو اور دوستوں سے نیکی کر چلو" ۔ لیکن نظیری اس کو پسند نہیں کرتا اور احسان کا دائرہ تنگ کرنا چاہتا ہے۔ لطف عام کو مکروہ جانتا ہے پھر اس کو ایک مہمل نظریہ سے ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

از کاہش محبّاں بر قدر خود فزائید — با ایں خسیس مردم یاری مگیر یارا

یعنی ایسے لوگوں سے جو دوستوں کی قدر گھٹا کر اپنی عزت بڑھاتے ہیں حسن سلوک نہ کرو ۶

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

خواجہ صاحب فلاسفہ کے غیر منتج قیاسات پر خط بطلان کھینچتے ہوئے فغمۂ حقیقت بلند آہنگی کے ساتھ اپنے ساز میں سناتے ہیں ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

جب فلسفہ اسرار کائنات کے عقدے حل کرنے سے عاجز آتا ہے تو یہی اعتراف کرتا ہے اور عقل صائب کا یہ فتویٰ تسلیم کئے بغیر حکیم کو کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا لیکن ایک فاقد البصیرۃ مباحث حکمیہ و مسائل فلسفیہ کو بجائے باطل کو غیر مفید ہونے کے ان کی دقت و دشواری کا انکار کرکے خواجہ کا رد کرتا ہے ۔ چنانچہ نظیری کہتا ہے ؎

جہاں رانیست آں معنی کہ باید فکر آں کردن — الف با خوان ہر مکتب شناسد ایں معمارا

مطلب یہ ہے کہ ہر طفل ابجد خوان جانتا ہے کہ عالم کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جس کی ادراک میں کسی کو غور و فکر کی حاجت ہو۔ ایک غلط دعویٰ کو کس دھوم دھام سے پیش کیا ہے ؎

گر ہمیں مکتب است و ایں مُلّا — کار طفلاں تمام خواہد شد

ہم نہیں سمجھتے کہ اس ژاژ خائی و یاوہ سرائی کا جنون نظیری کو کس وقت ہوا اور اس نے یہ بڑ یاں کیوں بکا۔ ایسے اشعار اس کے یہاں اور بھی ہیں جن پر نقد کرنا تضیع وقت و

تطویل لاطائل ہے۔ مذکورہ اشعار میں تغزل کی کوئی شان نہیں ہے اور ان اشعار کو غزل کہنا بھی روا ہے خواجہ صاحب کا مرتبہ غزل میں ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے ان کے بعد جس قدر فحول اساتذہ آئے سب کو ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور کسی کو دعویٰ ہمسری نہیں ہوا۔ خواجہ صاحب کو فارسی شاعری کی طرح عربی شعر میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے جو فصاحت و بلاغت ان کے فارسی اشعار کا خمیر ہے وہی عربی میں نمایاں ہے فارسی اوزان و بحور میں عربی اشعار اور مصرعے اس طرح کسی نے نہیں موزوں کئے جیسے کہ خواجہ صاحب نے کئے ہیں اور ان کو کمال برجستگی اور لطافت کے ساتھ فارسی اشعار سے دست و گریبا کیا ہے یہ کمال صرف خواجہ صاحب کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ اس ہنر میں کوئی ان کی گرد کو نہیں پہونچا۔ نظیری نے اپنے دیوان کی پہلی غزل میں خواجہ کے تتبع پر مطلع کا پہلا مصرع اور مقطع کا دوسرا مصرعہ عربی کہا ہے۔ اس جنون کی بھی کوئی حد ہے؟ خواجہ کے دیوان میں صدہا اشعار اور مصرعے عربی ہیں جن کا جواب ایک عربی شاعر بھی نہیں دے سکتا لیکن نظیری بیچارہ صرف دو مصرعے کہکر خواجہ صاحب کی غزل کا جواب دیتا ہے، ان مصرعوں کو ایک ابجد خوان کی عربیت کا نمونہ سمجھنا چاہئے۔ اہل ذوق کے نزدیک وہ مصرعے بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ نظیری کی پہلی غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے ؎

اذا ماشئت ان تحیٰ حیوۃ حلوۃ الحیا — برسوائی برآور سر ز مستوری برون نیا

نظیری گر طمع داری کہ مقبول مغاں باشی — فلا تحسد ولا تنجل ولا تحرص علی الدنیا

مقطع میں "مغاں" کی کوئی مناسبت نہیں ہے، بالکل بے محل اور حشو واقع ہوا ہے اگر "مغاں" کے بجائے "جہاں" ہوتا تو بہتر تھا۔ نظیری نے خواجہ کی غزلوں پر بہت غزلیں لکھی ہیں ہم یہاں پر دونوں کے چند ہم زمین اشعار بالمقابل درج کرتے ہیں جن سے سرسری طور پر نظیری کے حوصلۂ پرواز کا اندازہ ہو سکتا ہے

حافظ

صوفی بیا کہ آئینہ صاف ست جام را — تا بنگری صفائے مئی لعلفام را

راز دروں پردہ زرندان مست پرس — کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

عنقا شکار کس نشود دام باز چین — کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما — مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما

مستی بچشم شاہد دلبند ما خوش ست — زانرو سپردہ اند بمستی زمام ما

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

چندان بود کرشمہ و ناز سہی قدان — کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما

حافظ ز دیدہ دانۂ اشکے ہمی فشاں — باشد کہ مرغ وصل کند قصد دام ما

دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدارا — دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز — باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست — با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

عالم از نالۂ عشاق مبادا خالی... — کہ خوش آہنگ و فرح بخش نوائے دارد

محرم دار دلم کیں گمس قدیر ست — تا ہوا خواہ تو شد فرہمائے دارد

بود آیا کہ در میکدہ ہا بکشایند — گرہ از کار فروبستۂ ما بکشایند

بصفائے دل رنداں و صبوحی زدگاں — بس دربستہ بمفتاح دعا بکشایند

نظیری

درخور اگر نیم مئے لعل فام را — اے کاش ترکنند ببوئے مشام را

خارج ز پردہ دخل غلط تا بکے کنیم — مطرب بما نداده نشانِ مقام را

کس جذبۂ بکار دلِ ما نمی کند — تا چند سر بجاقہ در آریم دام را

مستی ربودہ از کفِ ہستی زمام ما — مطرب نمی دہد خبرے از مقام ما

خود را برہنہ بر صف شمشیر می زنیم — کاندر فنائے ماست بقاء دوام ما

دانی کہ نور مردمکِ چشم عالمیم — بینی اگر بدیدۂ معنی خرام ما

خرمن ببا درفت دریں دشت پر فریب — مرغے نشود گوشۂ بائے بدام ما

از مرغزار عقبیٰ تا سبزہ زار دنیا — تا دانم از کجائی حرفے بگو خدا را!

از خوردہ کہ دارد گل در قبا نگنجد — تا بنگہ ہست ذوقی میگردد آشکارا

انصاف و مہربانی عہد از جہان برانداخت — شد راستی خوشامد شد دوستی مدارا

ہر سر شاخ دریں باغ ہوائے دارد — ہر گلے رنگے و ہر مرغ نوائے دارد

یک شکر کام امیدم ہمہ شیریں کردست — نزد خود ہر سگے فرہمائے دارد

ہر سحر سلسلہ از بائے صبا بکشایند — گرہ کشادش گرہے از دل ما بکشایند

ہر کجا فتنۂ آں چشم سیہ درکار ست — کفر باشد کہ زبانزد عا بکشایند

نظیری بیچارہ کیا چیز ہے خواجہ کا مقابلہ غزل میں آج تک کوئی نہ کر سکا۔ قدماء و متاخرین میں ان کا پایہ ممتاز ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

چہ جائے گفتہ خواجو و شعر سلمان ست — کہ شعر حافظ شیراز ہے ز شعر ظہیر

(حکیم) سید اعجاز احمد معجز سہسوانی

خاکِ دامنگیر

حمید خاں میرے والد کے زمانہ کے ملازم تھے۔ یہیں جوان ہوئے اور یہیں بڈھے ہوگئے۔ شادی نہیں کی جوانی میں زیادہ وقت ورزش میں گزارتے، کشتی لڑتے یا مجھے کھلایا کرتے۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب میرے والد کا انتقال ہوچکا تھا اور حمید خاں کی عمر پچاس سے زیادہ تھی۔ اب ان کا وقت بانس کی چھڑی یا غلیل بنانے میں زیادہ صرف ہوتا، ان چیزوں کا انھیں خاص شوق تھا۔ رات کے وقت خانصاحب اکثر قصے کہانیاں بھی سنایا کرتے۔ ہمارے یہاں اب ان کا وجود نوکر کی طرح نہیں تھا بلکہ ایک بزرگ و مربی کی حیثیت سے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے بارعب چہرے اور رکھ رکھاؤ نے محلے والوں میں بھی انکی ایک مستقل شخصیت قایم کردی تھی۔

حمید خاں کی زندگی عجیب و غریب تھی۔ کم از کم اس قدر "ہموار قسم" کا انسان مجھے نہیں ملا۔ زمانہ کے حوادث ان کی زندگی پر کبھی زیادہ اثر انداز نہ ہوسکے۔ انھوں نے مصیبت کو کبھی مصیبت نہیں سمجھا اور نہ مسرت کے خوشگوار لمحے ان کو زیادہ مسرور کرسکے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ حمید خاں کے مزاج میں انکا نسلی عنصر بھی شامل تھا یعنی یہ ان کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ کسی لطیف شے کو لطیف سمجھ کر لطف اندوز ہوسکیں۔

دو سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں دفتر میں کام کی زیادتی تھی اس لئے میں اکثر کاغذات مکان پر لے آتا اور صبح نو بجے تک ان کے ساتھ دماغ سوزی کرتا تھا۔ اس روز خلاف معمول فقیروں نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ میں مکان کے بیرونی کمرے میں جو کہ سڑک پر ہے بیٹھ کر کام کر رہا تھا۔ اور وہ دن اتفاق سے جمعرات کا تھا۔ جب پہلے فقیر نے آکر صدا دی اور میرے انہماک میں مخل ہوا تو میں نے اس کو ایک پیسہ دیکر ٹالدیا۔ لیکن نہ معلوم کیوں ہر پندرہ بیس منٹ کے وقفہ کے بعد رنگ برنگ کے فقیروں نے آنا شروع کیا اور میرے کام میں اس قدر حارج ہوئے کہ مجبور ہوکر مجھے حمید خاں کی مدد لینی پڑی۔ میں نے حمید خاں سے بلاکر کہا "خانصاحب، دیکھئے ان فقیروں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے ذرا یہیں باہر بیٹھ جایئے"، حمید خاں نے ایکبار آنکھیں نکال کر سڑک کی طرف دیکھا اور خفگی کے آثار چہرہ پر پیدا کرکے باہر چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد پھر کسی فقیر کو سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔

دوسرے دن پھر میں صبح کے وقت کمرے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس روز اتفاق سے دفتر کا کام نہیں تھا۔ فقیروں کی آمد نسبتاً کم تھی لیکن پھر بھی دو ایک نظر آچکے تھے۔ خانصاحب کو تو ان سے نفرت ہوچکی تھی وہ باہر چبوترے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے، بانس کی چھڑی بغل میں تھی اور متجسس نگاہیں ہر طرف اٹھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ کسی غریب مفلوک الحال فقیر پر بھی فقیر کا شبہ کرتے اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگتے اتفاق سے اسی وقت ایک لڑکی جس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہ تھی میرے کمرہ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ بررنگ سی گندی اور بوسیدہ ساری اس کے جسم پر تھی۔ ہاتھ میں المونیم کا ایک کٹورہ تھا۔ جس میں ایک پیسہ اور ایک دھیلا نظر آرہا تھا۔ چہرہ پر افسردگی کی وجہ سے اداسی چھائی ہوئی تھی اور نرم نرم ہونٹ سوکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میرا ہاتھ خود بخود جیب کی طرف گیا۔ لیکن فوراً ہی خانصاحب کا خیال آگیا اور میں رک گیا۔

خانصاحب کی کرخت آواز کانوں میں آئی "کیا ہے؟ وہاں کیوں کھڑی ہے۔ کیا چاہتی ہے۔ بھیک مانگتی ہے۔ ادھر آ۔ جلدی کر"۔ یہ تمام سوالات اور احکامات خانصاحب نے ایک ہی سانس میں صادر کردئے۔ وہ بیچاری سہم گئی۔ ہاتھ میں کٹورا کانپ گیا۔ وہ ساری کو سنبھالتی ہوئی آہستہ آہستہ خانصاحب کی طرف بڑھی۔ زانو بدلکر خانصاحب نے حقہ کا ایک لمبا کش لیا چھڑی کو ہاتھ میں دبایا اور کھڑے ہوگئے، میں نے یہ سمجھا کہ خانصاحب اس غریب لڑکی کو اس بیدردی سے نہ ڈانٹ سکیں گے جس طرح وہ دوسرے فقیروں سے پیش آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس کے چہرہ کی معصومیت اور مظلومیت ضرور خانصاحب پر اثر انداز ہوگی اور ان کی زبان زیادہ کرختگی اختیار نہ کرسکے گی۔ لیکن خلاف توقع خانصاحب نے اس کو بھی نہایت نامناسب طریقہ سے جھڑکنا شروع کیا۔

بولے "بھیک مانگنے آئی ہے - شرم نہیں آتی - جوان ہے - بدن میں قوت ہے - ہر طرح کا کام کر سکتی ہے - کام چور - محنت مزدوری کر کے پیٹ کیوں نہیں پیدا
رتی - مفت مانگ مانگ کر کھانے کی عادت ہو گئی ہے" لڑکی بالکل سہمی ہوئی خانصاحب کے سامنے کھڑی کانپ رہی تھی - آنکھیں نیچی تھیں اور چہرہ کا رنگ اُڑ چکا
تھا - خاں صاحب اپنی آواز بلند کرتے جا رہے تھے "تو جوان ہے - کمبخت کسی مصیبت میں پھنس گئی تو بھیک مانگنے کا سارا مزا بھول جائے گا - مگر کیا ٹھیک - مکار
ہیں کی کمانے نکلی ہے . . . ." خانصاحب یہاں تک کہہ چکے تھے کہ یکایک ان کو لڑکی کے رُخساروں پر آنسوؤں کے قطروں کی چمک نظر آئی اور شاید ایک سسکی بھی
سنائی دی - میں تو خانصاحب کی طرف سے نا اُمید ہو گیا تھا - لیکن نہ معلوم وہ کیا سمجھے اور جلد ہی انھوں نے نرم الفاظ میں اس کو سمجھانا شروع کیا - "دیکھ بیٹی ! زمانہ
راب ہے تو بھیک مانگنا چھوڑ دے، یہ کام بڑا ذلیل ہے اور تیرے لایق ہرگز نہیں - تو چاہے تو میں تجھے کسی کارخانے میں کام دلانے کی کوشش کروں ؟" لڑکی
نے خانصاحب کو کوئی جواب نہ دیا - جدھر سے آئی تھی اسی طرف آہستہ آہستہ واپس چلی گئی - کٹورے والا ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا — میں اخبار پڑھنا بھول چکا تھا
ں نے بڑھکر اس لڑکی کو ایک اکنی دینی چاہی لیکن اُس نے گردن کے اشارہ سے انکار کر دیا - اس کی سسکیاں میری اس حرکت سے تیز ہو گئیں - اور وہ جلدی
ے گلی کے موڑ پر گھوم گئی - میں نے خانصاحب کی طرف دیکھا وہ قدرے افسردہ نظر آ رہے تھے - وہ کچھ دیر تک لڑکی کی طرف دیکھتے رہے - جب وہ گلی میں داخل
و گئی تو آہستہ آہستہ گردن جھکائے ہوئے مکان کے صدر دروازہ کی طرف بڑھے دروازہ کے قریب پہونچکر انھوں نے ایک بار گردن کو جنبش دی اور "اُف"
ی آواز سنائی دی - گویا سارے حزن و ملال کے اثرات کو انھوں نے چشم زدن میں اس طرح محو کر دیا - وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے - زیادہ دیر تک غمگین رہنا
سند نہیں کرتے تھے -

میرے اوپر اس واقعہ کا خاص اثر تھا - . . . کئی روز تک وہ فقیرن مجھے اکثر یاد آتی رہی - جب بھی خانصاحب میرے سامنے آتے ان کے کرخت الفاظ مجھے
د آجاتے - میں یہ تو جانتا ہی تھا کہ خانصاحب غیر معمولی طبیعت کے انسان ہیں، مگر اس واقعہ نے میرے خیال میں اور بھی استحکام پیدا کر دیا اور میں نے از سر نو
خانصاحب کا مطالعہ شروع کیا - اکثر میں موقع نکال کر اُن سے دیر تک گفتگو کرتا اور موضوع کو تھوڑی دیر کے بعد "عورت" کی طرف رجوع کر دیتا - پہلے تو خانصاحب
نے مجھے زیادہ منھ نہ لگایا اور نہ مجھے زیادہ موقع ہی ملا کہ اطمینان کی گفتگو ان سے کروں - ایکروز رات میں خانصاحب سے میں نے قصہ کہنے کی فرمائش کی - خیال یہ ہے
کہ درمیان سے قصہ کا رخ اپنے مطلب کی طرف پھیر دوں گا - میں چاہتا تھا کہ خانصاحب سے ان خیالات کا علم حاصل کروں جو وہ عورت کی طرف رکھتے ہیں - مجھے
اس قسم کا شوق ہمیشہ سے رہا کہ اس قسم کے عجیب الخلقت لوگوں کا نفسیاتی مطالعہ کروں - خانصاحب نے حُقّے کا ایک کش لیتے ہوئے قصہ شروع کیا - درمیان میں
ایک جگہ بیان کیا "شاہزادہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور جنگل میں راہ بھٹک کر کھو گیا - پریشاں حال پیاس کی شدت سے نڈھال - گھوڑے پر چلا
جا رہا تھا کہ ایک جگہ اسے ایک جھونپڑی نظر پڑی - خدا کا شکر ادا کر کے وہ وہیں اُتر پڑا تاکہ اپنی پیاس بجھائے - جھونپڑی میں اس کو ایک نوجوان لڑکی ملی -
نہایت حسین - چندے آفتاب چندے ماہتاب - اس نے اس کو دیکھا اور فوراً عاشق ہو گیا - میں نے خانصاحب کو روک دیا - "یہ تو بتایئے اس کی کیا وجہ ہے
کہ کسی نے جوان لڑکی کو دیکھا اور عاشق ہونا ضروری ہو گیا" — "مجھ سے اس قسم کی واہیات باتیں نہ پوچھو" خانصاحب نے ناراضگی کا اظہار کیا -

"آخر کچھ تو بتایئے - ماجرا کیا ہے - ابھی اس روز آپ نے بھی اس نوجوان فقیرن کو دیکھا تھا لیکن آپ تو عاشق واشق نہیں ہوئے"

"تم قصہ سنو گے یا نہیں - اگر مجھے ستاؤ گے تو میں پھر کبھی قصہ نہ کہوں گا"

"خانصاحب ! دیکھیے آپ خفا ہو جاتے ہیں لیکن یہ باتیں آپ نہیں بتائیں گے تو کون بتائے گا"

خانصاحب کچھ نرم ہوئے "بھئی، جانتے ہو کہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی عورتوں سے دلچسپی نہیں رہی - چاہے وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہوں - - -
ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا"

"آپ پہلے یہ بتایئے کہ آپ کو عورتوں سے دلچسپی کیوں نہیں ہے" میں نے اُن کو پھر چھیڑا -

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی"

"دیکھو ! - تم قصہ سنو گے یا نہیں - مین اور سب کچھ نہیں جانتا - میں نے شادی نہیں کی - سمجھے"

"اچھا تو نہ بتایئے - ناراض کیوں ہوتے ہیں" - میں نے اپنے چہرہ پر افسردگی طاری کر کے کہا - خانصاحب کو میں بہت عزیز تھا - وہ تھوڑی دیر

تک خاموش کچھ سوچتے رہے پھر بولے "میرے والد نے مجھے تعلیم دی تھی کہ عورت سے ہمیشہ ڈرو۔ چنانچہ میں نے ابتدا ہی سے اس پر عمل کیا اور کچھ قدرت نے بھی
دل ایسا بنایا ہے کہ وہ جلد ایسی چیزوں کی طرف مایل نہیں ہوتا۔ زندگی میں کئی بار میں نے بھی اپنے قدم میں لغزش محسوس کی ہے لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔۔۔۔
اب میں تم سے کہاں تک کہوں۔ ایسی ایسی ہزاروں عورتوں کو میں دیکھ چکا ہوں۔ یہ فقیرن مجھ پر کیا اثر کرتی۔ اور دیکھا تم نے میں اسے اچھی باتیں سمجھا رہا تھا لیکن
اس نے برا مانا اور لگی رونے"۔ خانصاحب پر پھر غصہ طاری ہو رہا تھا، میں نے خانصاحب کو روکا "سنئے تو آپ کو اپنی زندگی میں کسی عورت کی ضرورت محسوس
نہیں ہوئی، کوئی کمی آپ نے اپنی زندگی میں نہیں پائی"۔ "توبہ کرو"۔ خانصاحب نے خاص انداز میں فرمایا۔ "جس چیز کو میں قابل نفرت سمجھتا ہوں اس کی مجھ کو کم
محسوس ہو۔ میں نے تو کہدیا تم سے کہ عورت کو میں نے کبھی اپنا بنانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ عورت بہت کمزور فطرت کی ہوتی ہے۔ معمولی جھونکے بھی اس کو جھکا د
کے لئے کافی ہیں۔ میں نے تو تنہا زندگی گزار دی۔ اسی میں مجھے بہت آرام رہا۔ اب آخری ایام میں میں تو بہت خوش ہوں۔ خدا آپ لوگوں کو ہمیشہ زندہ رکھے"۔ یہ د
کلمات کہکر خانصاحب خاموش ہو گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد خانصاحب نے پھر قصہ شروع کیا اور نہ معلوم کب تک کہتے ر
میں تو سو گیا۔

اس کے بعد دور دور تک میری اور خانصاحب کی کوئی خاص گفتگو نہ ہوئی۔ تیسرے دن اتوار تھا۔ میں دن بھر گھر ہی پر رہا۔ شام کے وقت خانصاحب سے
بات چیت کا پھر موقع ملگیا۔ وہ صحن میں بیٹھے بانس کی غلیل بنا رہے تھے، چاقو سے چھیلکر اسے نہایت مشقت کے ساتھ سڈول کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب پہونچ
کہنے لگے۔ "دیکھو بابو یہ غلیل بہت عمدہ ہوگی یہ جو مرزا صاحب ہیں نا بیچارے بہت دنوں سے کہہ رہے تھے، انھیں کی فرمائش پوری کر رہا ہوں سوچتا ہوں کہ ایسی
بنا کر دوں کہ عرصہ تک یاد رکھیں"۔ "جی ہاں، بہت اچھی غلیل طیار ہوگی"۔ میں نے بھی خانصاحب کا دل بڑھایا۔ "آپ تو خانصاحب غلیل چلانے میں
ماہر ہیں۔ آجکل شکار وغیرہ چھوڑ دیا ہے کیا"

"بھئی!۔ اب آنکھوں کی روشنی بہت کم ہو گئی ہے۔ ورنہ تمھیں تو یاد ہوگا میں غلیل ہی سے کبوتر اور فاختے مارلایا کرتا تھا"۔ خانصاحب نے فخریہ
"جی ہاں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے"۔ میں نے خانصاحب کو پھر چھیڑنا چاہا "خانصاحب! یہ فاختہ بہت ہی معصوم اور غریب پرندہ ہے میں تو
مارنا پسند نہیں کرتا"۔ "ہاں بھئی۔ بات تو ٹھیک کہتے ہو" خانصاحب نے میری تصدیق کی۔

"مجھے بھی بڑا ترس آتا ہے۔ بڑا بھولا اور حسین پرندہ ہے"

"تو آپ کو حسین چیزیں پسند آتی ہیں"

"دیکھو" خانصاحب نے اپنے مخصوص انداز سے کہا۔ "تم نے آج پھر مجھے پریشان کرنا شروع کیا"

"جی نہیں"۔ میں نے کہا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ خوبصورت اور حسین چیز ہر ایک کو اچھی معلوم ہوتی ہے"

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عورت کا حسن میرے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتا" خانصاحب نے اس طرح کہا گویا وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔ "میں حسین
کو بدصورت کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کے پاس حسن ایک ایسی چیز ہے جس سے وہ بڑی سے بڑی مہم بھی
کر سکتی ہے — میں بھی ایکبار اس فریب میں مبتلا ہو چکا ہوں۔۔۔۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو"۔ "کون سی بات خانصاحب۔ ذرا میں بھی سنوں"
میں نے اصرار کیا۔

"نہیں نہیں۔ تم کو نہیں بتاؤں گا — تم بہت شریر ہو۔ مجھ سے تمام باتیں سننا چاہتے ہو" اس کے بعد میں نے بہت اصرار کیا۔ لیکن خانصاحب نے میر
ایک نہ سنی۔۔۔۔ میرا اصرار ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ خانصاحب کی نظر یک بیک سڑک کی طرف اٹھی۔ "دیکھو، وہ فقیرن آج پھر اس طرف آئی"۔ خانصاحب نے
میں نے دیکھا تو سڑک پر وہی لڑکی ہاتھ میں کٹورا لئے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڈھی عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔

خانصاحب اس کی طرف بڑھے۔ میں نے انھیں روکنا چاہا کہ وہ اُسے برا بھلا نہ کہیں۔ خانصاحب نے کہا "میں ذرا اُس سے بات چیت کروں گا۔ ا
غریب کو سمجھا دوں۔ کہیں کسی بدمعاش کی نظر پڑ گئی تو مصیبت میں پڑ جائے گی"۔ خانصاحب اس لڑکی کے پاس گئے۔ میں دور ہی سے دیکھتا رہا۔ خانصا
نے اس سے کچھ بات چیت شروع کی۔ اور ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ بہت دور تک چلے گئے وہ کافی دیر تک واپس نہیں آئے۔ میں منتظر بیٹھا رہا۔ اندھیرا ہوتے

ی واپسی ہوئی۔ میں نے دریافت کیا "اس لڑکی کے سمجھ میں آپ کی بات آئی یا نہیں"

"جی ہاں"۔ خانصاحب نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے ان کی آواز رُک رہی ہو

"اب تو وہ شاید بھیک نہ مانگے گی"

"معلوم نہیں۔ ممکن ہے نہ مانگے"

خانصاحب پر اس خاص بات کا اثر ہو چکا تھا۔ اُن کی آواز اور گفتگو کا وہ مخصوص طرز بدلا ہوا معلوم ہو رہا تھا، یہ دو چار جُملے کہکر خانصاحب اپنی ری میں چلے گئے۔ میں بھی کچھ سوچتا ہوا وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے روز پانچ بجے شام کے قریب میں دفتر سے واپس آ رہا تھا، میرے مکان کے پاس ہی سڑک پر املی کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے نیچے محلے ر لڑکے دن بھر جمع رہتے۔ میں نے اس درخت کے نیچے دیکھا۔ خانصاحب وہ فقیرن اور بڑھیا تینوں موجود ہیں، میں دور ہی ایک مکان کی آڑ میں ہو گیا ہ مجھے دیکھ نہ سکیں۔ میں نے دیکھا اس بڑھیا نے اپنی ساری کے کسی حصہ سے ایک چاندی کا چمکتا ہوا سکہ نکالا اور خانصاحب کے ہاتھوں پر رکھدیا۔ صاحب بُت کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ ان کے جسم میں ذرا بھی جنبش نہیں ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک بڑھیا دھیمی آواز میں خانصاحب سے کہتی رہی۔ جس کو میں فاصلے کی زیادتی کی وجہ سے سُن نہ سکا، تھوڑی دیر کے بعد بغیر اپنی باتوں کا ب نے ہوئے اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو چلی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ خانصاحب کچھ دیر تک اس کو دیکھتے رہے لیکن جب وہ اندھیرے میں چھُپ گئی تو ی مکان کی طرف واپس چلے گئے۔ میں یہ معمہ نہ سمجھ سکا۔ اس واقعہ کے ہر حصے نے مجھے عجیب قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی مکان کے اندر ی چلا آیا کپڑے تبدیل کئے منہ دھویا اور چائے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ کس عُنوان سے خانصاحب سے دریافت کروں کہ آخر ماجرا کیا ہے بڑھیا نے ان کو وہ روپیہ کیوں دیا اور ان سے کیا کہتی رہی۔ میں اسی اُدھیڑبُن میں تھا کہ میرے چند احباب آ گئے۔ چائے پی گئی۔ اور میں ان کے ہمراہ ے کے لئے نکل گیا۔

رات کے وقت جب میں سونے کے لئے طیار ہوا تو ارادہ کیا کہ خانصاحب کو پھر کہانی کہنے کے بہانے سے بلاؤں اور بات ہی بات میں ان سے اصلیت دریافت ں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خانصاحب خود آ گئے۔ ان کے چہرے پر میں نے آج تک اس قسم کی کیفیت نہیں دیکھی جیسی اس رات دیکھی تھی۔ انتہائی سی اور گھبراہٹ کا عالم تھا۔ قبل اس کے کہ میں ان سے مزاج پُرسی کرتا۔ انھوں نے خود کہا:۔

"میاں (وہ مجھے اسی نام سے پکارا کرتے تھے) آج میں آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ اب میں ان لوگوں کو چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں"

"کیوں؟۔ کیا ہوا؟۔ کیا بات ہے؟" میں نے گھبرا کر اُن سے سوالات کئے۔ میں اس اچانک حادثہ سے پریشان ہو گیا۔ مجھے خانصاحب کی ذات عزیز تھی۔ اور میں یہ آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھ کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔

"جی ہاں"۔ خانصاحب نے اس طرح کہا گویا انتہائی حد تک مایوس تھے۔ "اب مجھے جانے ہی دیجئے میرا جانا اب بہت ضروری ہے۔ مجھے دوسری جگہ یت ضروری کام ہے۔ مجھے اجازت دیدیجے۔ آپ کا احسان ہوگا"

"آخر کیوں؟۔ کہاں جائے گا؟ کیا ضروری کام درپیش ہے؟۔ بیٹھ جایئے اطمینان سے۔ کچھ مجھے بھی بتایئے آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں"۔ میں نے چند باتیں انتہائی خلوص کے ساتھ خانصاحب سے کہیں۔ وہ ایک طرف فرش پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ "میں اب یہاں سے دوسری جگہ جاؤں گا۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔ آپ کو بتا کر کیا کروں گا۔ اور آپ سُن کر کیا کیجئے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد واپس چلا آؤں لیکن اگر نہ آ سکا تو زیادہ دنوں تک میرا انتظار ت کیجئے گا۔ مجھے خانصاحب کی گفتگو سنکر یہ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی خانصاحب ہیں جو اپنے مزاج کی سختی اور طبیعت کی پختگی پر نازاں تھے۔

ان کی آواز اور چہرہ کی کیفیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ دل کے اندر طوفان برپا ہے۔ اور اندر ہی اندر خاموش قسم کی آگ سُلگ رہی ہے، اس انقلاب دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔ میں سمجھنے سے قطعی قاصر تھا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ میرا شدید اصرار بھی خانصاحب کو اپنے راز کے انکشاف کرنے پر ور نہیں کر سکتا میں نے اُن سے آخری اور کارگر سوال کیا "آج شام کو آپ املی کے درخت کے نیچے کھڑے کس عورت سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے

کہ اسی وقت سے آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے"

"جی نہیں"۔ خانصاحب نے گھبرا کر جواب دیا۔ "میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اب مجھے اجازت دیجئے میں کل صبح ہی رخصت ہو جاؤنگا"

"ذرا تشریف رکھئے" میں نے دوبارہ خانصاحب سے کہا کہ "اس وقت وہ فقیرن بھی غالباً وہاں موجود تھی اس بڑھیا نے آپ کو ایک روپیہ کیوں دیا تھا"۔۔۔۔۔۔ میں اتنا کہنے ہی پایا تھا کہ خانصاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بول اُٹھے۔ "تو آپ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔۔۔۔۔۔ اچھا تو سنئے۔ میں آپ کو ایک ایسا قصہ سُناتا ہوں جس کو عرصہ ہوا میں بھی بالکل بھول چکا تھا ——— مگر شرط یہ ہے کہ میں کل صبح ہی ضرور چلا جاؤں گا"

میں خاموش عالمِ حیرت میں بیٹھا رہا اور خانصاحب نے اپنی داستان یوں شروع کی :-

"یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب میں جوان تھا۔ آپ کے والد کی عمر بھی مجھ سے بہت زیادہ نہ تھی۔ میں ان کے ہمراہ علاقہ پر جایا کرتا تھا۔ اول تو وہ مجھ سے زیادہ مانوس تھے دوسرے میں جایداد کے کام میں ہمیشہ سے ہوشیار تھا مالگذاری وغیرہ کی وصولیابی میں ان کی کافی مدد کیا کرتا تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا میں آپکے والد کے ساتھ علاقہ پر تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ میں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا کہ یک بیک آپ کے والد صاحب کو کوئی بات یاد آئی۔ اور مجھے حکم ملا کہ چماروں کے محلہ میں جاکر ایک چمار کو بُلا لاؤ۔ میں تعمیل حکم کے لئے فوراً چلدیا۔ جب میں اس چمار کے مکان کے قریب پہونچا تو دیکھا کہ ایک نوجوان چمارن پنی آ رہی تھی۔ میں نے اس روز سے قبل اس گاؤں میں نہیں دیکھا تھا۔ شاید کسی کی مہمان تھی۔ نہ جانے کیوں میں نے اُس میں کچھ کشش محسوس کی لیکن آپ یقین مانئے کہ مجھے صرف ایک ہلکا سا خیال اُس کے چہرے کی جاذبیت کی نسبت پیدا ہوا تھا اور کچھ نہیں۔ جب وہ قریب آئی تو میں نے اُسی سے اس چمار کی موجودگی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے فوراً گھونگھٹ کر لیا اور دبی ہوئی زبان سے جواب دیا کہ اسے اس کے بارہ میں علم نہ تھا۔ خیر۔ میں آگے بڑھا اور اپنا کام کیا۔ یعنی اس چمار کو ساتھ لیا اور واپس ہوا۔ واپسی پر پھر وہ لڑکی مجھے کنوئیں پر پانی بھرتی نظر آئی۔ نہ معلوم کیوں اس مرتبہ میں اس کو دیر تک دیکھتا رہا۔ مجھے قطعی اعتراف ہے کہ اس وقت مجھے اپنے دل میں کچھ کمزوری محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی میں نے اپنی نگاہ دوسری طرف ہٹالی۔ اس چمار سے کھیتی اور غلّہ وغیرہ کے بارہ میں گفتگو کرنے لگا۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد دو روز تک یعنی جب تک کہ میں نے اس کو تیسری بار نہیں دیکھا وہ مجھے پھر یاد نہ آئی۔ تیسرے روز شام ہی کا وقت تھا میں آپ کے والد کے ہمراہ شکار سے واپس آ رہا تھا۔ وہ مجھے اسی کنوئیں پر نظر آئی۔ مجھے اس کی طرف دیکھنے میں ایک خاص لطف محسوس ہوا۔ میں اس کو پلٹ پلٹ کر دور تک دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ مجھے یقین ہے کہ اس نے بھی مجھکو دیکھا تھا۔ ممکن ہے یہ میرا خیال ہی ہو۔ خیر۔ اس روز رات میں قریب بارہ بجے میری یکایک آنکھ کھل گئی اور دیر تک اسکے بارہ میں نہ معلوم کیا کیا سوچتا رہا۔ کئی بار میں نے کوشش کی کہ اپنے خیال کو دوسری طرف رجوع کر دوں۔ لیکن ہر ایسی کوشش کے تھوڑی دیر بعد وہ پھر مجھے یاد آئی"

خانصاحب کچھ اس انداز سے یہ داستان بیان کر رہے تھے کہ گویا اپنے دماغ پر زور دیکر اس واقعہ کی ہر تفصیل کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان کے لب ولہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس واقعہ کے بیان کرنے میں ایک خاص قسم کی لذت محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ایسی لذت جس میں حزن و ملال کے عناصر بھی پوشیدہ تھے۔ میں نے خانصاحب کی زندگی کا ایک نیا ورق اپنے سامنے کھُلتا ہوا دیکھ رہا تھا اور اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ خانصاحب کی زبان سے میں آخری کہانی سُن رہا ہوں۔ خانصاحب نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہا :-

دوسرے ہی روز شام کو ٹہلتا ہوا میں پھر چماروں کی بستی کی طرف گیا وہ حسب معمول کنوئیں کی طرف آ رہی تھی۔ میں اس کو دیکھنے ہی کی غرض سے گیا تھا اور میں نے اس کو دیکھا۔ میرے ذہن میں فوراً ہی ایک خیال آیا۔ جس نے مجھے اپنے اندر کمزوری کا احساس کرایا۔ میں جلد ہی وہاں سے واپس چلا آیا۔ اس کے بعد دو دن تک میں آپ کے والد صاحب کے ساتھ وہاں رہا اور انھیں کے ہمراہ شہر واپس چلا آیا۔ کچھ دنوں تک وہ مجھے ضرور کبھی کبھی یاد آئی لیکن جلد ہی میں اسے بالکل بھول گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد مجھے پھر کسی ضروری کام سے آپ کے والد صاحب نے علاقہ پر بھیجا۔ جب میں راستہ میں تھا تو وہ مجھے پھر یاد آئی اور پانچ میل کا راستہ میں نے پاپیادہ اس قدر جلد طے کر لیا گویا میں دوڑتا ہوا گیا۔ میں کنوئیں کے پاس کافی دیر تک انتظار کرتا رہا مگر اسے نہ دیکھ سکا۔ عجیب قسم کی تکلیف مجھے محسوس ہوئی۔ اسی مایوسی کے عالم میں میں ندی کی طرف چلا کہ ذرا پانی کی روانی اور ہوا کی تازگی سے اپنے دل کی افسردگی دور کروں۔ میں ایک ارہر کے کھیت کے قریب سے گزر رہا تھا کہ وہ مجھے ندی کی طرف سے آتی ہوئی نظر آئی۔ میں اس کو دیکھ کر کسی قدر تک چونک اُٹھا۔ جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے ہمت کر کے اس سے دو ایک

سوال کے جس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک چمار کے یہاں مہمان تھی۔ کیونکہ اس کے گاؤں میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جا رہی واپس چلی جائے گی۔ میرے سوالوں کا جواب دیکر اس نے جلدی جلدی مکان کی طرف قدم بڑھایا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ مجھے اس کی اس حرکت سے تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ اس قدر تیز قدم اُٹھائے کیوں چلی جا رہی تھی — شام کا اندھیرا۔ ہوا کی بھینی بھینی خنکی، فضا کا بھاری پن از حد صبر آزما ثابت ہونے لگا۔ میں نے پھر اسے آواز دی وہ رُک گئی۔ میں اس کے قریب پہونچا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا گفتگو کروں۔ میرے اندر ایک بہت طاقتور قسم کا ہیجان اٹھ رہا تھا مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ اسوقت جو میری کیفیت تھی وہ اپنے وحشیانہ طرز کی وجہ سے حد درجہ مُہلک اور تباہ کن تھی۔ میرے اندر وہ جانور بیدار ہو چکا تھا جس کے متعلق میرا دعوے تھا کہ وہ پوری طرح میرے قبضہ میں ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن میں اس وقت بالکل اندھا تھا اور بالکل اندھوں کی سی حرکتیں مجھ سے سرزد ہوئیں۔

جب میں وہاں سے واپس چلا تو دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ منہ سے آواز تو نہیں نکلتی تھی لیکن گریہ کی تمام کیفیات جو انسانی قلب و دماغ پر انتہائی غم و اندوہ کا عالم طاری کر سکتی ہیں، موجود تھیں۔ میں اس منظر کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکا اور یہ سوچ کر کہ اُس غریب کو میری ذات سے جو تکلیف پہونچی تھی وہ شاید اس طرح ختم ہو جائے میں نے ایک روپیہ اس کی گود میں پھینکا اور وہاں سے تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر چلا آیا۔ ارہر کے کھیت کے دوسرے سرے تک مجھے اس کے سسکیوں کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ جیسے گناہ کے مکروہ شیاطین میرا مُنہ چڑھا رہے ہیں"

اس کے بعد خانصاحب تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ میں نے بھی سوال کرنے کی ہمت نہ کی۔ "یہ بڑھیا جس کو آپ نے آج شام کو درخت کے نیچے دیکھا ہے وہی چارن تھی"۔ خانصاحب نے آہستہ آہستہ کہا۔ جیسے ان کا دل کیفیات کے ہجوم سے خالی ہو چکا تھا اور وہ لڑکی کون تھی۔ میں نے فوراً دریافت کیا۔ بولے "وہ میری لڑکی ہے"۔ خانصاحب نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ میرے اوپر انتہائی افسردگی طاری ہو گئی۔ میں نے پوچھا "اور وہ روپیہ جو اُس بڑھیا نے آپ کے ہاتھ پر رکھا تھا"۔ بولے "یہ وہی روپیہ ہے جو میں نے کسی وقت اس کو دیا تھا"

خانصاحب نے اپنی داستان ختم کر دی اور اُٹھکر چلے گئے۔ میں نے روکنا چاہا کہ کچھ مزید سوالات کروں لیکن وہ نہ رُکے میں نے بھی سوچا کہ دوسرے دن صبح پھر گفتگو ہوگی۔

دوسری صبح کو خانصاحب اپنی کوٹھری میں نہیں ملے وہ جا چکے تھے۔

میں بہت دنوں تک تمام شہر میں تلاش کرتا رہا کہ شاید خانصاحب کا سُراغ مل سکے لیکن ناکام رہا۔ دو سال بعد مجھے گوالیار جانے کا اتفاق ہوا وہاں بعد نماز جمعہ جب میں مسجد سے باہر نکلا تو سیڑھیوں پر فقیروں کے گروہ میں خانصاحب کی جھلک نظر آئی، وہ لڑکی اور بڑھی فقیرن تھی آپ کے ساتھ صدا لگا رہی تھی۔

کلیم اللہ۔ ام۔ اس۔ سی

نگار کے پچھلے پرچے

(۲۶ء) جنوری عہ ر۔ (۲۷ء) اگست عہ ر۔ (۳۰ء) مئی عہ ر۔ (۳۱ء) جولائی ۸۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔ نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ ر۔ (۳۲ء) جنوری عا ر۔ فروری عہ ر۔ مارچ عہ ر۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ رنی پرچہ۔ نومبر عہ ر۔ (۳۳ء) فروری عہ ر۔ (۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر نی پرچہ۔ (۳۶ء) دسمبر عہ ر۔ (۳۷ء) جنوری عا ر۔ فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی جون، جولائی، اگست ۸ رنی پرچہ۔ اکتوبر عہ ر۔ (۳۸ء) جنوری سے ر۔ فروری ۸ ر۔ اپریل عہ ر۔ مئی تا دسمبر ۸ رنی پرچہ۔ (۳۹ء) جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ رنی پرچہ، ستمبر عہ ر۔ اکتوبر، نومبر ۸ رنی پرچہ۔ (۴۰ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا جون ۸ رنی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر نی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ رنی پرچہ۔ (۴۱ء) جنوری فروری عا ر۔ مارچ تا دسمبر ۶ رنی پرچہ۔ (۴۲ء) جنوری فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی، جون ۸ رنی پرچہ۔

ناظورۂ کشمیر

ناظورۂ نازنیں ہے اور میں
کشمیر کی سرزمیں ہے اور میں

قربان بہار ہو رہی ہے
رعنائی نثار ہو رہی ہے

ہر شاخ بجائے خود چمن ہے
اللہ اللہ عجب پھبن ہے

اُٹھتی کوپل کی اُف جوانی
اور اُس پہ لباس ارغوانی

ہر پھول دُلھن بنا ہوا ہے
ڈوبی ہوئی عطر میں ہوا ہے

یوں گرمیٔ حُسن سے ہے تپتی
بوٹے بوٹے کی پتی پتی،

گویا کندن کی ڈاک دے کر
یاقوت سے جڑ دیا ہے زیور

ہر گام پہ اک نیا ہے منظر
رنگیں، شاداب، حسن پرور

گل پھول کھلائے جا رہے ہیں
قالین بچھائے جا رہے ہیں

چھتنار چنار کا وہ سایا
جس سے گھونگھٹ گھٹائے کھایا

کہسار جو یوں تنے کھڑے ہیں
اُپچی ہیں کہ بات پر اڑے ہیں

تخئیل پہ حُسن چھا گیا ہے
جب باغ نشاط بن سکا ہے

فوارے چھٹے کہ مور ناچے
منقار میں موتیوں کے مالے

طاؤس سفید جو ہے عنقا
ہے اُس نے یہاں پر اجمایا

جادو فطرت کا چل رہا ہے
پانی گوہر اُگل رہا ہے!

تعمیر جو ایک خواب کی تھی
تعبیر ہے شالامار اُس کی

اک شور ہے آبجو کا ہر سو
اک حشر ہے رنگ و بو کا ہر سو

اُڑتا ہے یہ غول تتلیوں کا
یا قوس قزح سے رنگ برسا

اکثر ہوا موج گل پہ دھوکا
بہتا ہوا رنگ کا ہے دریا

دلکش کون ایسا گلکدہ ہے
تو ہی "فردوس گم شدہ" ہے

کشمیر کی مندری میں وہ نگ ہے
جس پر لہلوٹ سا راجگ ہے

خود حُسن کو تیری آرزو ہے
صنعت کا وہ شاہکار تو ہے

بیمار سے چشمہ کہہ رہا ہے
پی، آبِ حیات بہہ رہا ہے

آغوش میں سائے کے ہو کھاٹی
ہے دور پہ دھوپ پٹ پٹاتی

اک ننھی کے ہاتھ بھیجی پاتی،
"ہوتی جو چھما تو میں بھی آتی"

پتر کا جواب جب نہ پایا
چہرہ غصّے سے تمتمایا

ہلکان ہوئی جو روتے روتے
سو نلا گئی شام ہوتے ہوتے

دریا تھم تھم کے بہہ رہا ہے
موجوں کو سمیٹے کہہ رہا ہے

"آؤ کھو جائیں اس فضا میں
سو جائیں گلے میں ڈالے بانہیں"

کُل خطّہ ہے نقش زندگانی
چشمے ہیں رگیں، لہو ہے پانی

کھیتی یوں لہلہا رہی ہے
دریا کو پھریری آ رہی ہے

تاروں بھری رات گو حسیں ہے
چھب ٹکل کی نہیں ہے، ہاں نہیں ہے

جب آنکھ سے آنکھ لڑ گئی ہے
ناہید پہ اوس پڑ گئی ہے،

یہ بیچ میں پھول ہیں کنول کے
یا مانگ بھری ہے موتیوں سے

جو سمسی ادھ کھلی کلی ہے
جھومر بنے، اس کی کھلبلی ہے

گھاٹی میں جو گھر کہیں کہیں ہیں
گھونگھٹ میں چھپائے منھ حسیں ہیں

دوشیزۂ شگوفہ یاسمن کا
چلتا ہوا سحر بھولے پن کا

گو شرم و حیا کی پتلیاں ہیں
آنکھوں میں نہاں وہ بجلیاں ہیں

جو اہلِ ہوس کو خاک کر دیں
ہر سانس میں اتنی آگ بھر دیں

نیکوں کے لئے نویدِ عشرت
صورت پہ اضافہ حُسن سیرت

فطرت کی چہیتی بیٹیاں ہیں،
آنکھیں جنت کی کھڑکیاں ہیں

اور شہر کی زندگی کا نقشہ؟
جو شمع ہے آہ وہ فسردہ!

تاریک فضا ہے، دل رُندھا ہے
چہرے پہ دھواں سا چھا رہا ہے

آنکھوں میں پڑے ہوئے ہیں حلقے
رخ زرد ہے بال اُلجھے، اُلجھے

...ین خرامیاں تو کیسی — ہے موت یہاں شگفتگی کی — کھلتا نہیں اس میں راز کیا ہو — موتی سرِ کوہ جڑ دیا ہے
...بدلی چھنٹی وہ چاند جھانکا — درشن کرنے کو شنکرا کا[1] — ہے تیاگ کسی کا یا تپسیا — جس نے مندر کا چولا بدلا
...روں کی بھی ٹکٹکی بندھی ہو — سنسار "خموش آرتی" ہے — دینے کو یہ درس ہوشمندی — انجامِ فنا ہے سربلندی
...نسیں سینوں میں رُک گئی ہیں — پھولوں کی جبینیں جھک گئی ہیں

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

غزل : (پروفیسر) شور

جنوں قیدِ تکلم سے نکل جاتا تو اچھا تھا — ترا ہر درد اگر اشکوں میں ڈھل جاتا تو اچھا تھا
مری اک خامشی پر اتنی تنقیدیں زمانے کی — ترے ہی منہ سے اک نالہ نکل جاتا تو اچھا تھا
مرا احوال اب تک پوچھتے ہیں پوچھنے والے، — اگر عنوانِ غمخواری بدل جاتا تو اچھا تھا
وہ غم جو قیدِ لفظ و صوت میں آ ہی نہیں سکتا — حدودِ اشک سے آگے نکل جاتا تو اچھا تھا
میں تنہا رہ گیا ہوں اِک فضائے برق و طوفاں میں — نشیمن بھی چمن کے ساتھ جل جاتا تو اچھا تھا
زمانے کی نگاہیں میری جانب اُٹھتی جاتی ہیں — ترے رخ پر ترا آنچل سنبھل جاتا تو اچھا تھا
کھڑا ہوں شورؔ اب تک منزلِ عہدِ تمنا پر، — یہ ساحل بھی تلاطم سے بدل جاتا تو اچھا تھا

غزل : سلیمان اریبؔ

چاہتا ہوں انجمن آرائیاں ! ! — ہاں ابھی کچھ حوصلہ افزائیاں
کس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئیں — چاند کیوں لینے لگا انگڑائیاں
جیسے کوئی لہر اُبھرے اور دبے — اللہ اللہ! ان کی وہ انگڑائیاں
ایک پیکر پھول بھی اور آگ بھی — میں نے دیکھی ہیں تری رعنائیاں،
ان سے تو اچھی ہے نادانی مری — گر یہی ہیں آپ کی دانائیاں،
تیرے دل کی وسعتوں کے سامنے — ہیچ ہیں آفاق کی پنہائیاں

---

[1] شنکراچاریہ یا تخت سلیمان۔ سری نگر میں ہزار فٹ اونچی ایک پہاڑی ہے۔ جس پر ایک مندر واقع ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس پہاڑی کو مقدس مقام سمجھتے ہیں۔ ایک مندر کہتا ہے، ایک مسجد!

قتیل پنجابی تھا

مئی کے نگار میں جناب سید اسد علی انوری فرید آبادی کا مضمون "قتیل کا وطن" شایع ہوا ہے۔ اس کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے:۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں ذکرِ غالب کی اشاعت کے بعد جب میں نے غالب کے متعلقات پر کام شروع کیا تو قدرتاً قتیل کے خاندان و وطن کا مسئلہ بھی میرے سامنے آیا۔ اس سلسلہ میں متعدد تذکرے دیکھے لیکن مجھے مصحفی کے سوا کسی اور پر اعتبار نہیں ہوا۔ انوری صاحب فرماتے ہیں کہ مصحفی، قتیل کے وطن کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ نہ معلوم انھیں یہ غلط فہمی کیوں ہوئی۔ عقد ثریا کا جو اقتباس انھوں نے دیا ہے اس کا پہلا ہی فقرہ ہے:۔ "در اصل بزرگانش قوم کھتری بھنڈاری پٹالی بودہ اند"۔ انھوں نے غور نہیں فرمایا۔ اس میں لفظ پٹالی سے ان کا وطن مراد ہے۔ خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ میں نے دوسرے تذکرہ نگاروں پر مصحفی کے بیان کو اس لئے ترجیح دی کہ ان کے قتیل سے نہایت گہرے تعلقات تھے اور عقد ثریا بھی قتیل ہی کی تحریک پر لکھا گیا تھا۔ اس لئے طبعاً میں نے خیال کیا کہ اس باب میں مصحفی کی معلومات زیادہ صحیح ہوں گی۔

پٹالی یا پٹیالی۔ ضلع ایٹہ میں ایک مختصر سا قصبہ ہے اور اس لحاظ سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا کہ اسے حضرت امیر خسرو کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میرا ذہن سب سے پہلے اسی طرف گیا لیکن جب میں نے اس جگہ تحقیق کی تو نتیجہ کوئی نہ نکلا۔ یہاں کسی کو مرزا محمد حسن قتیل کا نام تک معلوم نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے اصل میں پٹیالہ ہو جو کاتبوں کی مہربانی سے پٹالی بن گیا ہے۔ لیکن پٹیالہ میں پوچھ گچھ کا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا۔ چونکہ ایک آدھ تذکرہ نویس نے لاہور کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس لئے میں نے یہاں بھی کھوج لگانے کی کوشش کی لیکن نتیجہ وہی ناکامی!۔ اگرچہ یہ غالب کے سلسلہ میں ایک ضمنی بحث تھی اور میرے اصل موضوع سے چنداں متعلق بھی نہ تھی کہ میں اسے اتنی اہمیت دیتا تاہم مجھے اپنی محنت کے رائگاں جانے کا افسوس ضرور تھا۔ مگر اس سے زیادہ حیرانی مصحفی پر تھی کہ اگر اس بھلے آدمی کو یقین نہیں تھا تو اس نے پٹالی کیوں لکھدیا۔

یوں جستجو کرنے کو تو میں نے پٹیالی تک کی خاک چھانی لیکن اس دوران میں ایک بات رہ رہ کے میرے ذہن میں آتی تھی کہ قتیل کا اصل وطن کہیں پنجاب ہی میں ہے اول اس لئے کہ بھنڈاری خاندان پنجاب کی پیداوار ہے دوسرے قتیل کے والد کا نام درگاہی مل۔ یہ نام ایسا ٹھیٹھ پنجابی ہے کہ میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ کر سکتا تھا کہ وہ دہلی، لکھنؤ یا فرید آباد کے رہنے والے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس ابتدائی تگ و دو کی ناکامی کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ حتیٰ کہ جنوری ۱۹۳۹ء میں نگار کا مصحفی نمبر شایع ہوا۔ اس میں ایک مضمون مشیر احمد صاحب علوی کاکوروی کا تھا جس میں انھوں نے "دیوان بیضا از مصحفی" کے حوالہ سے قتیل کا وطن بٹالہ لکھا تھا۔ دیوان بیضا کا وجود خارج میں ہے یا نہیں اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس وقت مجھے اس سے سروکار نہیں لیکن جونہی یہ پرچہ مجھے موصول ہوا میں نے بٹالہ میں ایک دوست کو خط لکھا کہ معلوم کر کے مجھے مطلع کریں کہ کیا وہاں بھنڈاریوں کے خاندان میں کوئی قتیل کو جانتا ہے اور مجھے کامیابی ہوئی۔

بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب) کا مشہور قصبہ ہے۔ امرتسر سے جو ریلوے لائن پٹھانکوٹ کو جاتی ہے اس پر واقع ہے اور ریلوے جنکشن بھی ہے۔ یہاں کا بھنڈاری خاندان بہت قدیم اور علم دوست خاندان ہے۔ قتیل اسی خاندان سے تھے۔

میں سب سے پہلے ان کے شجرۂ نسب کا ضروری حصہ درج ذیل کرتا ہوں:۔

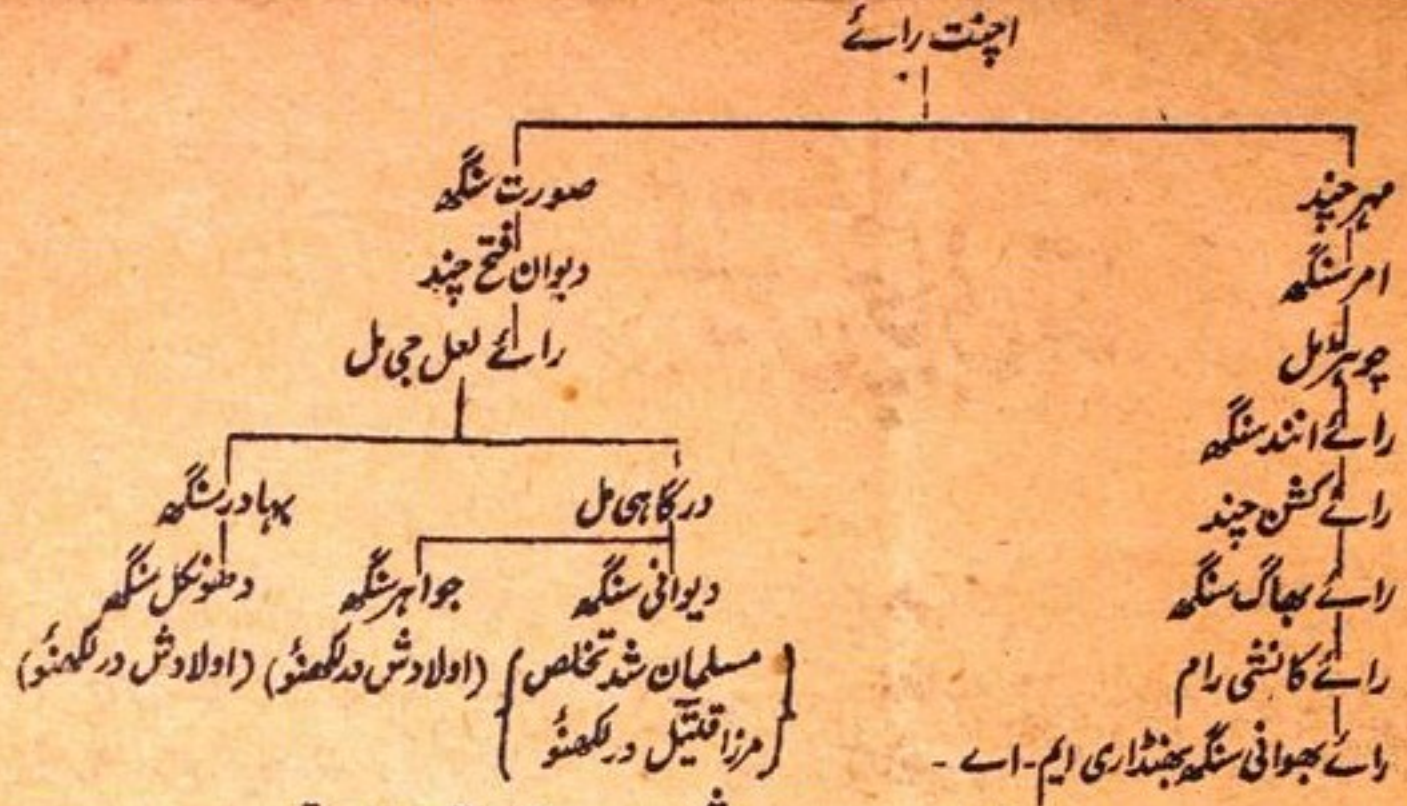

ے یہ شجرہ رائے بھوانی سنگھ بھنڈاری ایم-اے سے ملا ہے۔ اصل ان کے پاس موجود ہے۔ اس شجرہ سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :-
) قتیل کے خاندان کا اصل وطن بٹالہ (ضلع گورداسپور، پنجاب) تھا ـــــ (۲) قتیل کا اصل نام دیوانی سنگھ تھا (Diwani Singh)
دیوانی سنگھ ـــــ (۳) بٹالہ سے نقل مکان قتیل کے والد درگا ہی مل نے نہیں بلکہ ان کے دادا رائے لعل جی مل نے کیا ـــــ (۴) یہ نقل مکان قتیل کی
ائش کے بعد ہوا ـــــ (۵) قتیل کے سگے بھائی جواہر سنگھ اور چچا کے بیٹے بھائی دھونکل سنگھ دونوں کے ساتھ لکھا ہے "اولادش در لکھنؤ"
ں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خاندان نقل مکان کرنے کے بعد لکھنؤ گیا ہے نہ کہ فرید آباد یا شاہجہاں آباد ـــــ (۶) اس خاندان کا پیشہ شروع سے ملازمت
فارسی کا ذوق بھی پرانا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیری عہد کے مشہور مورخ سبحان رائے بھنڈاری بھی جن کی خلاصۃ التواریخ بعض لحاظ
سے نہایت بلند پایہ اور بے نظیر کتاب ہے اسی خاندان سے تھے۔ گمان غالب ہے کہ رائے لعل جی مل بھی لکھنؤ ملازمت کے سلسلہ میں گئے ہوں گے۔
انوری صاحب کے بیان کے مطابق اس خاندان کے جو افراد فرید آباد میں موجود ہیں ان کے پاس شجرہ موجود ہے جو درگا ہی مل تک ختم ہوتا ہے
یہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قتیل نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ پس یہ لوگ جواہر سنگھ کی اولاد ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ممکن ہے
ہ میں درگا ہی مل یا قتیل اور جواہر سنگھ دونوں بھائی لکھنؤ سے فرید آباد چلے آئے ہوں اور بہادر سنگھ اور دھونکل سنگھ والی شاخ فیض آباد یا لکھنؤ
ں رہ گئی ہو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ لکھنؤ چھوڑ کر فرید آباد کیوں آئے ؟ - اس سلسلہ میں دو باتیں غور طلب رہ گئی ہیں -

اول قتیل لکھتے ہیں :-

گرچہ باشد مولدِ من خاکِ دہلی اے قتیل — کم کسے چوں من زیزد دوایروں برخاست است

اگر وہ بٹالہ میں پیدا ہوئے تھے تو انھوں نے دہلی کو اپنا مولد کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ ان کی تعلیم و تربیت یعنی معنوی پیدائش
ہلی میں ہوئی تھی اس لئے انھوں نے "سخن گسترانہ" طور پر دہلی کو اپنا جنم بھوم لکھ دیا۔ اس میں وہ منفرد نہیں ہیں بعض دوسرے شعراء بھی یونہی اپنی
ائے تعلیم کی نسبت سے مشہور ہیں۔ انوری اگرچہ مہنہ یا بدھنہ کا تھا لیکن طوسی مشہور ہوا چونکہ اس کی تعلیم طوس میں ہوئی تھی اور مثالیں بھی
یجا سکتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دہلی پایۂ تخت ہونے کی وجہ "خاکِ دہلی" سے انھوں نے ہندوستان مراد لیا ہو ـــ دوم مصحفی نے بٹالی کیوں لکھا:
ممکن ہے کہ یہ لفظ اصل میں بٹالوی ہو جو بٹالی بن گیا۔ یعنی جس طرح مکہ سے مکی اور مدینہ سے مدنی لکھتے ہیں، اسی طرح بٹالہ سے نسبت کر کے
الی لکھ دیا ہو اور دو نقطوں کے اضافہ سے وہ بٹالی ہو گیا ہو - الغرض اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قتیل کا خاندان بٹالہ ضلع گورداس پور (پنجاب)
رہنے والا تھا اور قتیل کی پیدائش بھی بٹالہ ہی میں ہوئی -

مالک رام ایم - اے

مکتوبات نیاز

صدیقی - خط ملا - پڑھکر ہنسی آگئی - حیرت ہے کہ تیس سال کی ملاقات کے بعد بھی آپ میرا کمزور پہلو نہ جان سکے آپ نے وہ خدمت میرے سپرد فرمائی ہے کہ بنا بنایا کام بھی بگڑ جائے - عورت کے باب میں میرا نظریہ یہ ہے کہ وہ انتہائی گناہگار ہونے کے باوجود بھی اُویس و بایزید سے زیادہ معصوم ہے! یقیناً آسیہ بیگم نے زیادتی کی ہوگی اور آپ کے دوست کو شوہر ہونے کا پورا مزہ چکھایا ہوگا، لیکن

دھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو!

ان حضرت کو کیا سوجھی کہ خواہ مخواہ اپنے کو "قوامون علی النساء" ثابت کرنے کے لئے اُلجھ پڑے

اے حضت، وہ کسی پیر فقیر کی لڑکی تو ہے نہیں کہ باپ نے سر کا بوجھ اُتارنے کے لئے اس کی شادی کر دی ہو۔ نسل میں وہ آپ کے دوست سے بہتر، عزت و اقتدار میں وہ آپ کے دوست پر فایق، جاہ و ثروت میں وہ آپ کے دوست سے بڑھی چڑھی اور خیر صورت کا تو ذکر ہی فضول ہے کیونکہ اگر ایک آفتاب ہے تو دوسرا آفتابہ بردار! پھر آپ ہی بتائیے کہ اس حالت میں سوائے ایک 'فدوی' قسم کا شوہر بنے رہنے کے چارہ ہی کیا ہے۔ لیکن آپ کے دوست کی حماقت ملاحظہ کیجئے کہ بیگم سے وہ توقع رکھتے ہیں چاکری کی، کنیز بنے رہنے کی!

میں اس شادی کی تاریخ سے ناواقف نہیں ہوں - آسیہ بیگم کے والد نواب خاقان حسین پُرانی وضع کے بزرگ تھے اور آپ کے دوست (یوسف) کے والد سے ان کے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے، جب یوسف کے والد کا انتقال ہونے لگا تو وہ یوسف کو ان کے سپرد کر گئے۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کی مثال اس دُنیا میں شاید ہی کوئی مل سکے

خود حضرت یوسف سے پوچھئے کہ وہ گریجویٹ کس کی بدولت ہوئے، ملازمت انھیں کس کی کوشش سے ملی۔ رہنے کو کوٹھیاں، سیر کرنے کے لئے موٹریں، کس کے صدقہ میں انھیں میسر آئیں ـــــ حیرت ہے کہ خاقان حسین خاں کی آنکھ بند ہوتے ہی، ان کی آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے۔ انسانیت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ خود آسیہ بیگم کی خدمت کو سعادت سمجھتے نہ یہ کہ ان کو کنیز بنا کر رکھنا چاہتے ہیں - دماغ خراب ہو گیا ہے - کہدیجئے کہ وہ خود آسیہ بیگم سے جا کر معافی چاہیں مجھے بیچ میں نہ ڈالئے، ورنہ میں گیا تو یوسف کے خلاف ان کا جذبہ اور زیادہ مشتعل ہو جائے گا - میں آپ کی اور

یوسف کی سب سے بڑی مدد یہی کرسکتا ہوں کہ خاموش رہوں۔

کرمی ۔ ابواب کی تقسیم، عنوانات کی فہرست اور ترتیب کی نوعیت ، آپ کے خط سے معلوم ہوگئی۔ خوب ہے غالب کے متعلق لکھتے رہنے کا لوگوں کو جنون ہوگیا ہے، لیکن اس دفتر بے پایاں میں کام کی باتیں بہت کم ملتی ہیں۔ شرح کے سلسلہ میں تو خیر لوگوں نے ایسی عجیب و غریب حرکتیں کی ہیں کہ ہنسی آتی ہے، لیکن تذکرہ و انتقاد کی حیثیت سے جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی ہنوز محتاج تکمیل ہے۔ آپ کی کتاب مجھے زیادہ کام کی چیز معلوم ہوتی ہے، اسے جلد پورا کرکے چھپوا دیجئے

آپ نے چونکہ مشورہ کا شدید تقاضہ کیا ہے۔ اس لئے "کچھ نہ کچھ کہنے" کے طور پر کہوں گا کہ انتقاد کے سلسلہ میں نفسیاتی پہلو کو آپ نے بھی نظر انداز کر دیا

نقد و تبصرہ کے دو پہلو ہیں، ایک کا تعلق نقاد کے زاویۂ نگاہ سے ہے (اور اسی کو سامنے رکھ کر لوگ زیادہ طبع آزمائی کرتے ہیں) دوسرا پہلو خود شاعر کا نقطۂ نظر ہے اور اس پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے

ایک نقاد اسوقت تک صحیح نقد نہیں کرسکتا جب تک وہ اپنے زمانہ کو چھوڑ کر شاعر کے زمانہ میں نہ پہونچ جائے اور اپنی ہستی سے علٰحدہ ہوکر شاعر کی ہستی نہ اختیار کرلے۔ اس کے لئے ایک خاص قسم کے دوربینی (Telescopic) مطالعہ کی ضرورت ہے جو آسان نہیں۔ مثلاً غالب ہی کو لیجئے کہ جب تک آپ بہادر شاہ کی دلّی تک نہ پہونچیں اور غالب کی سی ذہنیت اپنے اوپر طاری نہ کرلیں، اس وقت تک اس کے کلام پر کوئی صحیح تبصرہ نہیں کرسکتے۔ اسی کو میں نفسیاتی انتقاد کہتا ہوں

اس سلسلہ میں غالب کی ہر غزل، اس کے ہر ہر شعر پر غور کرنا ہوگا یعنی اس کا کلام سامنے رکھ کر ہم کو غالب کی جذباتی زندگی کی ایک ایسی تاریخ مرتب کرنا ہوگی جو اس کے سیاسی، اقتصادی، و تمدنی ماحول سے علٰحدہ نہ ہو۔ اسی کے ساتھ آپ کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس نے کتنی غزلیں مقررہ طرحوں پر لکھی ہیں اور کتنی غزلوں کی زمین خود اس نے پیدا کی ہے۔ پھر اگر کوئی زمین خود اس نے پیدا کی ہے تو کیوں ؟ ظاہر ہے کہ پہلے کوئی مصرعہ یا شعر بے اختیار ہوگیا ہوگا اور پھر اس پر غزل کہی ہوگی۔ مثلاً مشکل زمینوں میں غالب کی ایک مشہور غزل ہے۔ "زبوں وہ بھی۔ خوں وہ بھی" میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے لئے پہلے کوئی طرح مقرر ہوچکی تھی بلکہ خود غالب کی پیدا کی ہوئی زمین معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ زمین کیوں اس کے ذہن میں آئی۔ یقیناً پہلے کوئی نہ کوئی شعر یا مصرع بے اختیار ہوگیا ہوگا اور پھر اس پر غزل لکھی ہوگی۔ اب آپ پوری غزل پڑھ جائیے اور غور کیجئے کہ اس میں کونسا شعر یا مصرعہ بے اختیارانہ نظم ہوگیا ہوگا۔ میری رائے میں سب سے پہلے مقطع غالب کے ذہن میں آیا ہوگا :۔

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے کہ جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

مقطع کے بعد اس کو فکر ہوئی ہوگی کہ ردیف و قافیہ کیا ہونا چاہئے۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہ بغیر قافیہ کے صرف بھی، ردیف کو سامنے رکھ کر غزل کہہ ڈالتا، لیکن غالبؔ کی مشکل پسند طبیعت کے لئے کہوں کو قافیہ قرار دیکر غزل کہنا مشکل نہ تھا، جبکہ زبوں، خوں، واژگوں اور رجوں ایسے اچھے اچھے قافیے سامنے موجود تھے۔ "وہ بھی" (ردیف) کو غالبؔ نے اس غزل میں جس خوبصورتی کے ساتھ نباہا ہے وہ ہر شخص کا کام نہ تھا۔ مطلع کہنا اور زیادہ مشکل تھا۔ لیکن باوجودیکہ دونوں مصرعوں میں ردیف کا تعلق ایک ہی چیز یعنی "دل" سے ہے، لیکن وہ کسی جگہ بیکار نہ ہوئی۔ میں اس غزل کو غالبؔ کی زندگی کا خاص کارنامہ سمجھتا ہوں اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس زمانہ میں ماحول کا جو رنگ تھا اس سے یہ غزل پوری طرح رچی ہوئی ہے اور غالبؔ کے صحیح جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے

آپ غالبؔ کی مشکل زمینوں میں کوئی نہ کوئی شعر یا مصرعہ ایسا ضرور پائیں گے، جو غزل کی بنیادی چیز ہوگا۔ مثلاً چند مشکل زمینوں کے بنیادی مصرعے ملاحظہ ہوں:-

ایک غزل ہے "لیالی نے مجھے"۔ "نہالی نے مجھے"، لیکن اس کا بنیادی مصرعہ یہ ہے:-

عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

غالبؔ نے بہت کوشش کی وہ اس زمین میں پوری غزل کہہ سکے، لیکن اول تو چار شعر سے زیادہ وہ فکر نہ کر سکا اور جو اشعار کہے وہ بھی کسی قابل نہیں ہیں، یہاں تک کہ اس بنیادی مصرعہ پر بھی کوئی اچھا مصرعہ ہاتھ نہ آیا اس غزل کی ناکامی کا سبب صرف یہ تھا کہ جس جذبہ کے تحت وہ ایک مصرعہ ہو گیا تھا اس کو سنبھالنے والے قافیے دوسرے میسر نہ آسکے اور غزل "برائے گفتن" کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکی

یہی حال بالکل پہلی غزل کا ہے کہ سوائے بنیادی مصرعہ "صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا" کے اور کوئی شعر یا مصرعہ پیدا نہ ہو سکا

بہرحال کلام غالبؔ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے اور اگر آپ نے کوئی عنوان "نفسیاتی" گفتگو کے لئے الگ کر لیا ہے تو اُس سلسلہ میں یہ بحث بہت پُر لطف رہے گی۔ اگر زحمت نہ ہو تو مطلع فرمائیے کہ آپ نے اس خیال کو پسند کیا یا نہیں!

عزیزی - ہاں، شکر ہے، علیل ہوں اور دماغی تعطیل کا لطف اُٹھا رہا ہوں، آپ کو یہ تمام حالات کیونکر معلوم ہوئے؟ میں نے تو کوشش کی تھی کہ گھر سے باہر کسی کو میری علالت کا علم نہ ہو، یہاں تک کہ

ض مخصوص احباب و اعزہ کو بھی بے خبر رکھا۔ معلوم ہوتا ہے، آپ نے اپنا کوئی جاسوس میرے یہاں
ھوڑ رکھا ہے - بہتر ہے - اس کی فکر بھی کروں گا

واقعی حالت بُری تھی اور اب بھی کچھ اچھی نہیں - لیکن معلوم ہوتا ہے قدرت نے پھر چند دن کی مہلت
یدی ہے - خیر — پرسش حال کا شکر گزار

ارے بھئی، اُن کی کیا ہے

وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

شکل تو ہماری تمھاری ہے کہ "ڈوبنے جائیں تو دریا ملے پایاب ہمیں"!

تم نے اچھا کیا، اپنی توقعات اُدھر سے ہٹالیں - اُن کے اچھے ہونے میں کلام نہیں، لیکن اُن کی اچھائی سے فایدہ
ٹھانے کے لئے دل خون کرنے کی فرصت و ہمت چاہئے!

میری رائے میں زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر اظہار رنج و بیزاری کے آپ نہایت خوشدلی کے
ساتھ علٰحدہ ہوجایئے - سہ چند میں جانتا ہوں وہ حقیقت سمجھ جائیں گے، بلا کے ذہین ہیں - تاہم یہ بجھنا بجھتی تو ختم
ہوجائے گی

میں خود ان سے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا، میرے تمھارے تعلقات سے واقف ہیں، فوراً سمجھ جائیں گے۔
یک اور صاحب کے ذریعہ سے اس مسئلہ کو چھیڑوں گا - امید تو نہیں کوئی اچھا نتیجہ نکلے، لیکن حرج بھی کیا ہے۔

تمھارا فی الحال کسی بہانہ سے رخصت لیکر چلا آنا بھی مناسب نہیں - معاملہ تازہ ہے، وہ سمجھ جائیں گے کہ
یہ بھی ایک قسم کا احتجاج ہے - بہرحال چند دن صبر کرو اور میرے دوسرے خط کا انتظار -

---

"نگار"

جنوری ـــــ ۱۹۴۱ء اور جنوری ـــــ ۱۹۴۲ء

یہ دونوں پرچے آپ کے پاس ہیں یا نہیں - اگر نہیں ہیں تو اب طلب فرمایئے یا ان میں سے کوئی ایک ہے اور دوسرا نہیں، تو دوسرا بھی منگالیجئے
ورنہ ایک وقت آئے گا کہ مومن نمبر، ظفر نمبر، اُردو شاعری نمبر، ہندی شاعری نمبر، کی طرح یہ دونوں نمبر بھی کسی قیمت پر نہ مل سکیں گے - ان دونوں نمبروں
کی اہمیت کا اندازہ اگر آپ اس وقت نہ کریں گے تو بعد میں کریں گے، لیکن یہ وقت وہ ہوگا جب آپ انھیں حاصل نہ کرسکیں گے -

مینجر نگار

کیا کہنا!

وہ کاشمیر وہ اُس کی بہار کیا کہنا
وہ تا بنا کئ لیل و نہار کیا کہنا

کیا ہے سنگ میں پیدا مزاج شیشے کا
بنائے جب ہیں ترے کوہسار کیا کہنا

ہجوم یاسمن و لالہ و بنفشہ سے
زمیں ہے رنگ کا اک حشر زار کیا کہنا

ہر ایک قطرے میں اک جوش ہے ترنم کا
بساط نغمہ ہے، یا جوئبار کیا کہنا

نسیم صبح کی سرگوشیاں شگوفوں سے
چُرا کے بوسہ یکایک فرار! کیا کہنا

مہک رہی ہے دُلھن کی طرح کہیں نرگس
بہک رہا ہے کہیں آبشار کیا کہنا

کبھی ہے چشمک گل میں پیام بیداری
کبھی وداع شکیب و قرار کیا کہنا

چمن سے دور کھِلے ہیں چمن سے باغی پھول
پسند آئے کھُلے مرغزار کیا کہنا

بجائے زرد کے ہر شاخ ارغوانی ہے
تری خزاں بھی ہے رشکِ بہار کیا کہنا

تمام حُسن کی دنیا، تمام کیف و سرور
زمانہ بھی ہو اگر سازگار کیا کہنا

رباب شعر پہ گاتا ہوں گیت مستی کے
نہ میں ہوں رند نہ میں بادہ خوار کیا کہنا

اثرؔ کہ شاعری اب تک تھی جسکی محبوبہ
ہوا اداؤں کا تیری شکار، کیا کہنا

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثرؔ

باب الاستفسار

شرح کلام مومن

(ب سید علی سجاد مرزا صاحب۔ سہارنپور)

پچھلے مہینے جس غزل تک شرح کلام مومن کا سلسلہ پہونچا ہے اس کے آگے کے اشعار پیش کرتا ہوں۔ توجہ فرمائیے:۔

۱۔ ہجراں میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں — جانداد شوخ بے وفا ہوں

دونوں مصرعوں کا کیا تعلق ہے۔ ہجراں میں زیست چاہنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

۲۔ اُف کر گئی یاد گرمجوشی — میں آتش مردہ سے جلا ہوں

یہ شعر بالکل سمجھ میں نہیں آیا، گرمجوشی کسے یاد کر گئی اور آتش مردہ سے جلنا کیا؟

۳۔ کیا شکوہ جفائے آسماں کا — میں آپ کو دور کھینچتا ہوں

پہلے مصرعہ کا دوسرے سے کیا تعلق ہے۔

۴۔ خود بینی و بیخودی میں ہے فرق — میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

کم نما ہونا کیا معنی؟

۵۔ مجھ رمز شناس سے یہ باتیں — کیا خوب میں غیر سے بُرا ہوں

معلوم ہوتا ہے اس شعر میں بہت سے محذوفات ہیں۔

۶۔ ہر دم رہین کشمکش دست یار ہیں — چلون کے بند کس کے گریباں کے تار ہیں

۷۔ کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں — جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

۸۔ عمر دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو — دیکھو زمان ہجر کے امیدوار ہیں

۹۔ شبنم خراب مہر و کتاں سینہ چاک ماہ — لو اور بھی ستمزدۂ روزگار ہیں

۱۰۔ شب وصل اسکے تغافل کی زبس تاب نہیں — تلخی مرگ ہے آنکھوں میں شکر خواب نہیں

مومن کو شکر خواب کی فرصت کہاں سے مل گئی؟

۱۱۔ دل کا کیا حال کرے دیکھئے یہ گرمی حسن — ٹھہرتا آئینۂ یار میں سیماب نہیں

۱۲۔ آہ فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں — جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں

۱۳۔ ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

۱۴۔ اظہار دوستی کی خوشی کیا شب وصال — دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں

۱۵۔ باتیں وہ تیری ہوشربا ہیں کہ کیا کہوں — جو کوئی رازداں ہے مرا رازداں نہیں

دوسرے مصرعہ میں رازداں کا رازداں نہ ہونا کیا معنے رکھتا ہے۔

۱۶۔ نومیدی جواب ہے کیوں اتنے شوق پر — یہ کیا ہوا کہ میں پس قاصد رواں نہیں

۱۷۔ کرتے وفا امید وفا پر تمام عمر — پر کیا کریں کہ اس کو سر امتحاں نہیں

۱۸ - اس کو بھی جانتا ہوں فریب وصال غیر — تمکو عبث یقین ہے کہ میں بدگماں نہیں
۱۹ - اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاع روزگار — دُنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں
۲۰ - میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا — آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں
۲۱ - اُس بُت کی ابتدا رجوانی مراد ہے — مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

(نگار) - ۱ - ہجر کے زمانہ میں کوئی عاشق زندہ رہنا نہیں چاہتا، لیکن مومن ایسا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک شوخ بے وفا کے عاشق ہیں اور بیوفائی کا انتقام ان میں پیدا ہونا چاہیئے۔

۲ - اس شعر کے پہلے مصرعہ کو آپ نے غلط پڑھا۔ یوں پڑھئے: - "اُف کر گئی - یادِ گرمجوشی" — اُف کر جانا یعنی پھونک جانا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی گرمجوشی کی یاد مجھے پھونک گئی۔ گویا یوں سمجھئے کہ مُردہ آگ نے مجھے جلایا۔ مُردہ آگ اسلئے کہا کہ اب وہ گرمجوشی کہاں ہے۔ صرف اسکی یاد باقی رہگئی تھی جس نے پھونک کر رکھدیا۔

۳ - میں آسماں کا شکوہ کیا کروں گا، میں خود اپنے آپ کو اس سے زیادہ بلند سمجھتا ہوں۔ یعنی آسمان کا شکوہ کرنا میری خودداری و عالی حوصلگی کی توہین ہے۔

۴ - "کم نما" ہونا یعنی اپنے آپ کو چھپانا۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو صرف خود بینی کی وجہ سے پوری طرح کسی کے سامنے نہیں آتے اور یہاں میں اپنی بیخودی کی وجہ سے خود اپنے آپ سے بھی چھپا ہوا ہوں اس لئے میں اس باب میں تم سے بڑھا ہوا ہوں۔

۵ - محبوب نے مومن سے کہا کہ یہ زمانہ دوستی کا نہیں ہے۔ اسپر مومن نے کہا کہ میں یہ باتیں خوب سمجھتا ہوں۔ کیا میں غیر سے بھی بُرا ہوں کہ اسکے لئے تو زمانہ دوستی کا ہو اور میرے لئے نہیں۔

۶ - جس طرح عاشق کے ہاتھ گریباں کو تار تار رکھتے ہیں، اسی طرح محبوب کے ہاتھ چلون کو بھی تار تار رکھتے ہیں۔

۷ - محبوب جتنا زیادہ بے حجاب ہوتا ہے، اتنا ہی ہم شرم کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے۔

۸ - اس شعر میں مومن نے یہ ظاہر کیا ہے زمانِ ہجر سے زیادہ طویل مدت اور کوئی نہیں ہوتی۔

۹ - مومن کے صحیح رنگ کا شعر ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تنہا میں ہی تحیر زدہ نہیں بلکہ شبنم بھی آفتاب کی محبت میں پریشان ہے اور کتاں بھی ماہتاب کے عشق میں سینہ چاک ہے۔ اصل مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو تعلق شبنم و آفتاب، یا کتاں و ماہتاب میں ہو وہی مجھ میں اور میرے محبوب میں ہے۔

۱۰ - شکر خواب مومن کا نہیں، بلکہ محبوب کا مراد ہے۔

۱۱ - آئینہ سیماب سے طیار کیا جاتا ہے، لیکن گرمی حسن کا یہ عالم ہے کہ وہ آئینہ کے پشت پر ٹھہرتا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر مومن کو خیال آتا ہے کہ دیکھئے گرمی حسن سے اس کے دل کا کیا حال ہو۔ سیماب سے دل کو تشبیہ بھی دیتے ہیں۔

۱۲ - دنیا میں اب ہر جگہ تیرے غم سے فلک شگاف آہیں بلند ہوتی ہیں۔ پہلے یہ فتنے آسمان سے نازل ہوتے تھے اور اب تمہارے دور میں زمین ہی سے اُٹھتے ہیں۔

۱۳ - مومن کا خاص شعر ہے۔ آشیاں کی بربادی مسلم ہے، اس لئے اگر صیاد کی نگاہ اُس طرف نہیں تو بجلی کا ڈر ہے۔

۱۴ - تمہارا مجھ سے وصل میں محبت کا اظہار کرنا باعثِ خوشی نہیں ہو سکتا، کیونکہ رقیب سے تمہاری ناہربانیوں اور بے وفائیوں کا حال سُن چکا ہوں۔

۱۵ - "رازداں" اس لئے رازداں نہیں کہ تیری ہوشربا باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

۱۶ - شوق کا تقاضہ یہ تھا کہ قاصد کے پیچھے پیچھے مومن خود بھی ساتھ جاتے، لیکن جواب کی طرف سے اتنی مایوسی ہے کہ وہ اس کی ہمت نہ کر سکے۔

۱۷ - جب محبوب کو وفا کا امتحان ہی مقصود نہیں تو پھر کس امید پر وفا کیجئے۔

۱۸ - تم کہتے ہو میں بدگمان نہیں، حالانکہ اس سے مراد تمہاری صرف یہ ہے کہ میں دھوکے میں آکر وصال غیر کے معاملہ کو بھول جاؤں۔

۱۹ - دُنیا کی باتیں میری نگاہ میں اتنی حقیر ہیں کہ مجھے اپنی ناکامیوں کا خیال بھی نہیں آتا۔

۲۰ - تمہاری شوخیاں مرنے کے بعد بھی مجھے آسودہ دیکھنا نہیں چاہتیں۔ اسی لئے تم نعش پر آئے ہو۔

۲۱ - جس چیز کو فتنۂ آخر زماں کہتے ہیں وہ اُس بُت کی ابتداء جوانی ہے۔

وقت کی باتیں

مغربی ایشیا کا قدیم ترین دروازہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے، جرمنی کے تازہ حملۂ بہار کی خبر سنکر کوہ قاف کے عبور پر، کے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار "امرت بازار پتر کا" میں کیا ہے، ان کا اقتباس یہ ہے :-

"اگر جرمن فوجیں کوہستان قاف کو عبور کرنے میں کامیاب ہوگئیں تو داہنے ہاتھ پر انھیں عراق اور ترکی کی سرزمین، بائیں ہاتھ پر ہندوستان کا راستہ اور سامنے ایران ملے گا اور اگر وہ تمام موانع کو دور کرنے کے بعد شمالی ایران تک پہونچ گئیں تو اس میں شک نہیں کہ تمام مغربی ایشیا کے لئے یہ نہایت سخت خطرہ کی بات ہوگی۔

بالکل ظاہر ہے کہ جرمنی اور جاپان کے مابین کوئی مفاہمت ہوگئی ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس مفاہمت کی بنا پر، جاپان بحیرۂ عرب اور بحر احمر تک پہونچنے کی کوشش کرے۔

جب میں نے جریدہ نمائے کراچ پر جرمن حملہ کی خبر سنی تو مجھے خیال آیا کہ دیکھئے تاریخ بھی کس کس طرح اور کتنی بار اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل مسیح کی بات ہے جب سیتھیا والوں (Scythians) نے اسی کوہستان قاف کی بلندیوں کو عبور کرکے سلطنت اسیریا پر حملہ کیا تھا اور وہاں اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ ہیروڈوٹس نے بھی اس حملہ کی داستان ہمیں سنائی ہے اور توریت میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

دو سو سال کے بعد سائرس اعظم کے زمانہ میں پھر اس سرزمین کو تاریخی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور شمال کی وحشی قومیں پھر قاف کے دروں سے گزر کر لوٹ مار شروع کردیتی ہیں۔

اس کے بعد کئی صدی تک تاریخ خاموش نظر آتی ہے، لیکن پہلی صدی عیسوی میں مشہور عبرانی مورخ جوزیفس پھر مغربی ایشیا کے اس پھاٹک کا ذکر کرتے ہوئے اس کی فوجی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ اس کے کئی صدی بعد ایران کے ساسانی بادشاہوں کے زمانہ میں، رومہ کی فوجوں نے پھر اسی راستے سے حملے شروع کئے اور ۵۲۹ء میں رومن جنرل بلی سیریس نے اپنی مہم اس طرف روانہ کی۔ اس حملہ کا ذکر پروکوپیس نے کیا ہے جو خود بھی فوج کے ساتھ تھا۔

کوہ قاف گویا ایک بلند سنگی دیوار ہے جس نے شمال کو جنوب سے بالکل علیحدہ کردیا ہے اور قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ایشیا پر حملہ کرنے کے لئے ہر حملہ آور کو یہ دیوار عبور کرنا پڑی ہے اور شاید اسی لئے مسیح سے ۲۰۰۰ سال قبل اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ پھاٹک بند کرکے مغربی ایشیا کو حملوں سے محفوظ کردیا جائے۔

اگر آپ نقشہ کو دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ مشرق کی طرف بحر کاسپین واقع ہے اور مغرب کی طرف بحر اسود اور کوہ قاف کا سلسلہ ایک کے ساحل سے شروع ہوکر دوسرے کے ساحل تک چلا گیا ہے۔ گویا قدرت نے اس پھاٹک کے درمیان ایک بلند دیوار اٹھا دی ہے۔

قدیم زمانہ میں اس دیوار کو عبور کرنے کے صرف دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو بالکل پہاڑ کے درمیان ہوکر ہے جو بعد کو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہوا۔ موجودہ نقشوں میں یہ درہ ولادی کاکاز اور طفلس کے درمیان دکھایا گیا ہے۔ جب سیتھیا والوں نے اسیریا پر حملہ کیا تھا تو شاید اسی راستہ سے کیا تھا۔ دوسرا راستہ پہاڑ کے مشرقی ڈھلوان حصہ کی طرف سے ہے اور بحر کاسپین کے مغربی ساحل کی طرف اس حصۂ زمین تک پہونچتا ہے جسے آذربیجان کہتے ہیں اور سائرس کے زمانہ میں شمال کی وحشی قومیں اسی راستہ سے ساحلی مقاموں پر حملہ کرتی تھیں۔

تاریخ سے یہ پتہ تو نہیں چلتا کہ کب لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ مسیح سے بہت قبل ایک غیر معمولی انسانی کوشش اس بات کی گئی تھی کہ مضبوط دیوار کھڑی کرکے ان دروں کو بند کردیا جائے۔ یہ دیوار، دیوار چین سے قبل کی چیز ہے اور اس لئے تاریخ میں اپنی قسم کی بالکل پہلی کوشش تھی۔ یہ دیوار لوہے کی بڑی بڑی سلوں سے بنائی گئی اور بجائے گارے کے پگھلا ہوا سیسہ استعمال کیا گیا تھا۔ اسی لئے جارجیا والے اسے اب بھی "لوہے کا پھاٹک" کہتے ہیں جس کا ترجمہ ترکی زبان میں "دمر کپو" ہے۔

یہ دیوار تو مغربی ڈھلان کی طرف بنائی گئی تھی، لیکن مشرقی ڈھلان کی طرف بھی ایک دیوار بنانا ضروری تھی، چنانچہ اس طرف بھی ایک دیوار طیار کی گئی جو زیادہ

لمبی تھی۔ الغرض دو دیواریں سمندر کے کنارے سے اُٹھائی گئیں جن میں سے ایک دو میل لمبی تھی، اور دوسری پچاس میل۔ ان دونوں دیواروں کا فصل ساحل کے قریب ۵۰۰ گز ہے، لیکن جتنی وہ آگے بڑھتی گئی ہیں ان کا فصل کم ہوتا گیا ہے یہاں تک کہ جب یہ فصل ۱۰۰ گز کا رہ گیا تو اس جگہ ایک قلعہ بنا دیا گیا۔

دربند، آذربیجان کا مشہور شہر انھیں دونوں دیواروں کے درمیان واقع ہے۔ پہلی دیوار میں کسی وقت لوہے کا پھاٹک تھا اور اسی کے اندر سے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ شہر کی دوسری جانب بھی آہنی پھاٹک تھا جس سے شمالی درہ بند ہوتا تھا اور اسی لئے اس شہر کا نام ساسانیوں کے زمانہ میں دربند پڑ گیا۔

ساسانیوں کے زمانہ میں اس مقام کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ شمال کی طرف سے حملہ کرنے والوں کی راہ میں یہی ایک بڑا زبردست قلعہ بند شہر تھا۔ چنانچہ تمام عرب مورخین و جغرافیین نے (مثلاً المقدسی والہمدانی) نے اس کا ذکر کیا ہے۔ الاصطخری، المسعودی، البیرونی اور یاقوت نے لکھا ہے کہ ساسانی بادشاہ اس مقام کو سلطنت کی کنجی سمجھتے تھے۔

جب عربوں نے اس حصہ کو ساتویں صدی ہجری میں فتح کیا تو انھوں نے بھی اس مقام کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اسے "باب الابواب" اور الباب کے نام سے موسوم کیا: مسعودی اور یاقوت نے اس کا نام باب الترک اور باب الخضر ظاہر کیا ہے۔

یہ دیواریں کس نے طیار کیں۔ تاریخوں کے بیانات اس باب میں بہت مبہم اور مجمل ہیں۔ بعض نے "خسرو انوشیرواں" کا نام بتایا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہو سکتا کیونکہ جوزیفس نے خسرو سے ۵۰۰ سال پہلے ان دیواروں کا ذکر کیا ہے اور پروکوپیس نے ۵۲۸ء میں خود ان دیواروں کے دیکھنے کا حال لکھا ہے۔ انوشیرواں کا زمانہ تمام مورخوں نے ۵۳۱ء اور ۵۷۹ء کے مابین متعین کیا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دیوار انوشیرواں کی بنوائی ہوئی نہیں ہے۔

جوزیفس اور پروکوپیس کا خیال ہے کہ یہ دیوار سکندر اعظم نے بنوائی تھی، لیکن تاریخی شہادتیں اس کے بھی خلاف ہیں۔ میرے نزدیک یہ دیواریں سائرس اعظم نے ۵۲۸ء - ۵۴۱ء ق۔م میں طیار کرائی تھی ہو سکتا ہے کہ ساسانیوں نے ان کی مرمت کرائی ہو۔ اور انوشیرواں نے ان کو از سر نو تعمیر کرایا ہو۔

دربند کی دونوں دیواریں اٹھارویں صدی کے اخیر تک پائی جاتی تھیں۔ ایک روسی سیاح نے ۱۷۹۶ء میں خود ان کو دیکھا تھا اور اپنی کتاب میں انکا حال لکھا تھا، لیکن جب ولیم جیکسن ۱۹۰۴ء میں یہاں گیا تو ایک دیوار کے آثار رہ گئے تھے اور دوسری باقی تھی۔ اس کے پانچ سال بعد جب میں گیا تو میں نے بھی یہ آثار دیکھے۔ آذربیجان کے مشہور پٹرولی چشمے دربند کے قریب واقع ہیں اور باکو انھیں کے جنوب میں ہے۔ باکو کا اصل نام بادکوبہ تھا (یعنی ہوا کا تباہ کیا ہوا شہر) قدیم ایرانی اس حصۂ زمین کو "آذر پایگاں" کہتے تھے کیونکہ یہاں کی پٹرول ملی ہوئی مٹی، خشک لکڑی کی طرح فوراً آگ پکڑ لیتی تھی (آذر پایگاں کے معنے ہیں "آگ کا مقدس استھان")۔ عربوں نے اس کو آذربیجان کر دیا۔

زمانہ کے انقلابات نے قاف کے ان دشوار گزار دروں اور راستوں میں بھی بہت سے تغیرات پیدا کر دئے ہیں چنانچہ وہ راستے جو آہنی دیواروں سے بند کر دئے گئے تھے اب وہاں رات دن ریلیں چلتی ہیں جو سیکڑوں مسافروں کو پہاڑ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچاتی رہتی ہیں۔

قاف کا اندرونی حصہ تفرج گاہوں، صحت گاہوں اور معدنی چشموں کی دولت سے بھرا پڑا ہے اور زار کی حکومت کے زمانہ میں جتنی بے توجہی اس طرف اختیار کی گئی تھی، اس کی پوری تلافی اب سوویٹ حکومت نے کر دی ہے۔

اگر جرمن فوجیں اس طرف آئیں تو وہ کدھر سے آئیں گی، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ آسان راستہ دربند ہی کا ہے۔

حُر جماعت کے تفصیلی حالات

پچھلے مہینے ہم نے اس جماعت کی بابت ایک مختصر سا نوٹ شایع کیا تھا جو بہت مبہم اور غیر واضح تھا۔ چونکہ اسوقت یہ جماعت جو سندھیوں اور بلوچیوں پر مشتمل ہے عام توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اس لئے ہم ذرا تفصیل کے ساتھ ان کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ پیروں کے جس ادارے سے اس جماعت کا تعلق ہے اُس کا سلسلہ محمد قاسم فاتح سندھ کے زمانہ سے ملتا ہے۔ لیکن جس زمانہ سے ان کو حُر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اُس کی ابتدا پچھلی صدی کے وسط سے شروع ہوئی۔ یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ سندھ میں ایک مقام کنگری ہے اور وہی اس ادارے کا مرکز رہا ہے۔ جب پچھلی صدی میں حزب اللہ شاہ کنگری میں اپنے باپ کے جانشین قرار پائے تو انھوں نے ضلع حیدر آباد میں اپنا خلیفہ ایک شخص غلام نبی کو مقرر کیا، لیکن ضلع حیدر آباد کے دوسرے حصہ میں حزب اللہ شاہ کے عم زاد بھائی پیر فضل اللہ شاہ بہت پہلے سے اپنا اثر جمائے ہوئے تھے، اور اپنی پرہیزگاری خوش بیانی

وغیرہ کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ یہ بات حزب اللہ شاہ کو کچھ پسند نہ آئی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۵ء کے ماہ رمضان میں پیر فضل اللہ شاہ کو گاؤں کی مسجد میں قتل کر دیا گیا۔ حزب اللہ شاہ اور غلام نبی دونوں کے خلاف مقدمہ چلا لیکن یہ سزا سے بچ گئے اور ان کے ایک عزیز کو ان کے عوض سزائے موت بھگتنا پڑی۔

خلیفہ غلام نبی چونکہ حزب اللہ شاہ کے بڑے وفادار ارادت مند تھے اس لئے اُن کو حُر کے لقب سے سرفراز کیا گیا (حُر سے مراد وہ مشہور ہستی ہے جو امام حسین کے ساتھ کربلا میں شہید ہوئے تھے)

خلیفہ غلام نبی نے یہ لقب پانے کے بعد ایک جماعت ہی اس نام سے قایم کی جس کی صورت تقریباً حسن بن صباح کی باطنی جماعت کی سی تھی۔ اس جماعت میں بکثرت سندھی اور بلوچی قبائل شریک ہونے لگے کیونکہ یہ جماعت ایک زبردست اخوت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کر رہی تھی اور بہت سے آوارہ اور جرائم پیشہ لوگ اس جماعت میں شریک ہو کر بہت سے ناجائز فائدے اُٹھا سکتے تھے۔

جب یہ جماعت اپنی دراز دستیوں کی وجہ سے بہت بدنام ہونے لگی تو پیر حزب اللہ شاہ کے ماموں کرم علی شاہ نے ان کی اصلاح کی کوشش کی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے کرم علی شاہ کو خود مار ڈالا۔ یہ واقعہ ۱۸۷۳ء کا ہے۔ اس کے بعد ایک شخص محمد صالح نے پھر اسی قسم کی اصلاحی کوشش کی لیکن ۱۸۸۳ء میں وہ بھی فنا کر دیا گیا۔ پھر ۱۸۸۸ء میں پیر حزب اللہ کے ایک معتمد ارادت مند نے اصلاح کا بیڑا اُٹھایا لیکن ان کا بھی وہی حشر ہوا رفتہ رفتہ اس جماعت کی ذہنیت زیادہ مجرمانہ صورت اختیار کرنے لگی چنانچہ موجودہ صدی کے اول بیس سال کے اندر صوبۂ سندھ کے تمام اطراف میں انھوں نے غارتگری شروع کر دی اور یہانتک قتل اور ڈکیتی کے الزام میں خود پیر بھی ماخوذ ہوئے لیکن سزا سے بچ گئے۔ البتہ ان کے سولہ ذاتی خادموں کو جلاوطن کی سزا دی گئی۔

اس وقت اس جماعت کے پیر صبغت اللہ شاہ جو پیر پگارو کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۲ء میں اپنے باپ کے جانشین قرار پائے۔ سندھ میں ایک پرانی پیشین گوئی چلی آتی ہے کہ یہاں کا ایک پیر جو چیچک رو ہوگا ایک دن سندھ کا بادشاہ بنے گا۔ چونکہ پیر صبغت اللہ چیچک رو ہیں اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی ان ہی کی ذات سے پوری ہونا ہے۔

جب ۱۹۳۰ء میں اس جماعت کے خلاف شکایتیں بہت بڑھیں تو سکھر کے اعلیٰ پولیس افسر نے پیر کے جائے قیام پر جسے کوٹ کہتے ہیں اور جو ریاست خیرپور میں واقع ہے دھاوا کیا اور کافی تعداد اسلحہ اور گولی بارود کی برآمد کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیر صبغت اللہ آٹھ سال کے لئے جیل بھیج دئے گئے اور دو ہزار روپئے جرمانہ ہوا ۱۹۳۶ء میں یہ سزائے قید بھگت کر واپس آئے تو اپنا اقتدار دوبارہ قایم کرنے کے لئے یہ حج کرنے چلے گئے۔ حالانکہ ان کے مرید بدستور ان کے غلام تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں صوبوں کو خود مختارانہ حکومت کے اختیارات دئے گئے تو اس سلسلہ میں پیر پگارو کو بھی کچھ سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی۔

پیر پگارو کے متبعین میں علاوہ حُروں کے ایک جماعت اور بھی ہے جو شریعت اسلامی کی کافی پابند ہے اور کافی امن پسند ہے۔ پیر پگارو کے ماننے والے تمام اس حصۂ زمین پر پائے جاتے ہیں جو سکھر کے جنوب سے ریاست خیرپور اور سندھ کے دوسرے اضلاع تک پھیلا ہوا ہے چونکہ نئے ریفارم میں رائے عامہ حاصل کرنے کا سوال تھا اور پیر پگارو کے ہزاروں مرید اُسی شخص کو رائے دے سکتے تھے جنھیں پیر صاحب پسند کریں اس لئے ان کی سیاسی اہمیت بہت بڑھ گئی۔

پیر پگارو نے اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر اپنے مریدوں کی تنظیم زیادہ وسیع پیمانہ پر شروع کر دی اور جانبازی کا حلف لوگوں سے لینا شروع کیا۔ ایسے لوگوں کو غازی کے نام سے یاد کرتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ ان غازیوں کی تعداد چھ ہزار تک پہونچ گئی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے اپنا مرکز خیرپور کے جنگلوں کو قرار دیا اور وہیں ان لوگوں کو فوجی تعلیم و تربیت دی جانے لگی لیکن جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ حکومت سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہی تو انھوں نے اعلان کیا کہ وہ حکومت کے لئے رسول گارڈ کی جماعت طیار کر رہے ہیں اور دس ہزار روپیہ وار فنڈ میں بھی دیا۔ اس کے بعد بھی غازیوں کی بھرتی برابر جاری رہی اور اُن کی فوجی تربیت میں زیادہ انہماک سے کام لیا جانے لگا۔

اس جماعت کے افراد ایک سو پچاس مربع میل سے زیادہ صحرائی رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور گاؤں والے ان سے بہت ڈرتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی گرفتاری آسان نہیں ہے۔ باوجودیکہ اس وقت وہاں مارشل لا جاری ہے کہا جاتا ہے کہ اس جماعت کے استیصال کے لئے مہینوں درکار ہیں۔

اعتبارات

شاید میں نے یہ سب کچھ خواب میں سُنا:-

فلسفی :- خدا کا تصور زمان و مکان کی قید کے ساتھ، اینشٹین کے فلسفۂ اضافیت کی طرح ہمارے تصور و خیال میں بھی انحنا چاہتا ہے۔ خدا کے ماضی کا تصور ہم طبقات الارض کے ذریعہ سے کرتے ہیں، حال کا تصور اخلاقیات کی وساطت سے اور مستقبل کا مابعد الطبیعیات کے وسیلہ سے ! - کس قدر عجیب بات ہے !--- حالانکہ خالق و مخلوق کے درمیان جو حقیقی رشتہ ہونا چاہئے، اس پر ان باتوں سے مطلق روشنی نہیں پڑتی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زاویۂ نگاہ جس سے کائنات کے پیدا کرنے والے کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تک انسان کی سمجھ میں نہیں آیا اور اسی زاویہ کی جستجو انسان کا فرض اولین ہے۔

مذہبی عالم :- انحناء - طبقات الارض - مابعد الطبیعیات - زاویۂ نگاہ !— یہ کیا بکواس ہے ——!

خدا - زبردست قدرت و جبروت والا خدا--- جو چاہے کرنے والا اور کسی سے باز پرس نہ کیا جا سکنے والا خدا— بغیر کسی حجت، و دلیل کے مانا جانے والا خدا--- اپنے قہر و غضب سے نافرمان انسان کو آتش جہنم میں جلا سکنے والا خدا— اور اگر خوش ہو تو فردوس کی لازوال شیرینیوں اور لذتوں سے مالا مال کر دینے والا خدا— ! کتنا صاف، سادہ اور سلجھا ہوا عقیدہ --- مگر تمہاری سمجھ میں نہیں آتا - کتنے بدنصیب انسان ہو--- میں سمجھتا ہوں کہ جدید زاویۂ نگاہ کی جستجو ہی تمھیں جہنم کے گوشہ میں لے جائے گی۔

صوفی :- جستجو بُری چیز نہیں - لیکن جس طرح مادیات کی جستجو سے خدا نہیں مل سکتا، اسی طرح اُسے ہم فردوس و جہنم میں بھی نہیں پا سکتے - خدا نام ہے "ہمہ اوست" اور "ہمہ از دست" کا - مگر اس کا علم "فنا فی الشیخ" کا درجہ حاصل کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ جس طرح خدا فلسفی کے فلسفہ سے بلند ہے، اسی طرح مذہب کی ظاہری قیود سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے - قلب پر لا الہ کی ضربیں لگاؤ تاکہ سویدائے قلب میں لطیفۂ غیبی سے روشنی پیدا ہو اور تم خدا کو دیکھ سکو۔

سائنس داں :- میں نہیں سمجھتا کہ خدا کو سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے - مہربانی کرکے آپ لوگ یہاں سے چلے جایئے۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے، میں سوچ رہا تھا کہ فضا میں کون کونسی شعاعیں ایسی موجود ہیں جن سے ہم دشمن کو میلوں دور بیٹھکر ہلاک کر سکتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ شعاع قریب قریب دریافت کر لی ہے۔

ناگہاں ایک شخص یہ شعر گنگناتا ہوا ادھر سے گزرا :-

خدا کو چار دیوار حرم میں ڈھونڈھنے والے
اِدھر آئیں، ذرا دیکھیں مرے ٹوٹے ہوئے دل کو

میری آنکھ کھُل گئی - دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا)

شہوانیات

ں کتاب میں مخاشی کی تمام فطری اور
طری قسموں کے حالات اور ان کی
ی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط
ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا
ہے کہ مخاشی دنیا میں کب اور کس کس
ح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے
ج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں
کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے
تین روپیہ (۳؍) علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (۳؍) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲؍) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مادیئن کا مذہب

۳- حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱؍) علاوہ محصول

شاعر کا انجام

ب نیاز کے عنوان شباب کا
ا ہوا افسانہ، حسن و عشق
تمام نشہ بخش کیفیات اسکے
ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ
انہ اپنے پلاٹ اور انشاء
لحاظ سے اس قدر بلند
ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر
ں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰؍)
علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱؍)
علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (۱؍۸؍)
علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اُردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲؍) علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی
لکھنؤ

"نگار" کے خاص نمبر

نگار بک ایجنسی
لکھنؤ

جنوری سنہ ۳۲ء

(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھکر ان کی شوخ نگاری کو دکھایا گیا ہے۔ صفحات ۱۵۶ — مع تصویر غالب (رنگین)

قیمت چار روپیہ (للعہ)
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۵ء
اور
جنوری سنہ ۳۶ء

بالکل ختم ہوگئے ہیں، جن حضرات کو اشد ضرورت ہوگی اُنکے لئے ہم دوسروں سے خرید کر فراہم کر سکیں گے لیکن قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہو سکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے گا دینا پڑے گی۔

جنوری سنہ ۳۷ء

ڈراما اصحاب کہف، خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارڈ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشاپردازی کا نمونہ ہیں۔ صفحات ۱۴۴ قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۸ء

تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس دقت نظر اور کاوش و تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲۔

قیمت تین روپیہ (سے ر)
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۹ء

(صحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ حیات مصحفی۔ اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۶۴
قیمت ایک روپیہ (عہ ر)
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۶۸
قیمت ایک روپیہ (عہ ر)
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دُنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزلگوئی پر بھی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے

قیمت دو روپیہ (عا ر)
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء

[illegible] نمبر میں ملک کے پانچ مشہور [illegible] اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ، غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء ہوا تھا، یہ نمبر گویا تتمہ ہے جنوری اور اُسکے ساتھ ہی اسکا مطالعہ بھی ضروری ہے ان دونوں نمبروں سے ملکر ایک ایسا تذکرہ مرتب ہوجاتا ہے جو اسوقت تک پیش نہیں کیا جا سکا۔ قیمت عہ ر

علاوہ محصول